جلد ۹۴ فروری ۱۹۸۱ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

جلد ۹۴ فروری ۱۹۸۱ عدد ۶

فروری ۱۹۸۱ء

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

فہرست مضامین

جلد ۹۴ | فروری ۱۹۸۱ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ ۳۰/- روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی پبلشر نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

اِن سطور کو لکھتے وقت پندرھویں صدی ہجری کے پہلے ماہ ربیع الاول کی دوسری دہائی ختم ہونے والی ہے۔ اور یہ شمارہ جب قارئین کو ملے گا تو اُس وقت ربیع الاول اختتام کو پہنچ رہا ہوگا۔

اِس موقع پر ایک لمحۂ فکریہ!

اِسلام آباد اور راولپنڈی میں مَیں نے دیکھا کہ ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئی۔ کوئی حساب نہ تھا جھنڈیوں کا جو ہر کوچہ و بازار میں لہرا رہی تھی، رنگ برنگی روشنیوں کے ہر طرف ریلے تھے اور ہجوم مرد و زن کے میلے۔ سیرت کی سرکاری کانفرنس کے علاوہ ہر مسجد اور ہال میں جلسۂ سیرت تھا۔ اور ہر محکمے اور ادارے کے زیر اہتمام میلاد کی مجالس ہو رہی تھیں۔ بے شمار اگربتیوں سے مہک دار دھوئیں کے ہلکے ہلکے مرغولے اُٹھ رہے تھے۔ مٹھائیوں کی دکانوں پر کھوئے اور شکر اور میدے اور گھی سے بنی ہوئی چوکور اور گول اور رنگ برنگی مٹھائیوں کے پہاڑ کھڑے تھے۔ جلوس رواں تھا، بلکہ کئی کئی جلوس اِدھر سے اُدھر متحرک تھے جن کی وجہ سے ٹریفک بند تھا۔ طرح طرح کے ملکی اور غیر ملکی لباس پہنے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کے اُمتیوں کی ٹولیاں درود و سلام پڑھتی اور قوالی کے طرز پر نعتیں گاتی گامزن تھیں۔

یہی سماں ہر شہر میں ہوگا، اور اس سے کم تر سہی، مگر دیہات میں بھی گہما گہمی ہوگی

سوال یہ ہے کہ کیا یہ تہواری جشن ہمارے کرداروں میں تبدیلیاں لانے کے لحاظ سے بھی کچھ افادیت رکھتے ہیں۔ خدا و رسول کے مقرر کردہ دو مبارک دن ـــــ یوم عید الفطر اور یوم عید الاضحیٰ ہوں یا

خود ہماری ایجاد کردہ تقاریب محرم و میلاد، ان کی رونق برسوں سے قائم ہے بلکہ مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ان چاروں مواقع پر ہر سال تلو تلو آدمیوں کے اخلاق اور معاملات میں تغیر آتا تو ۳۴ برس کے عرصے میں ہمارے یہاں تیرہ ہزار چھ سو کی تعداد میں صادق و امین افراد پیدا ہو سکتے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔

سوچیے کہ کتنے رشوت لینے والے ہیں جو یوم میلاد کے موقع پر حضورؐ کی یاد تازہ کر کے یا حضورؐ کی دعوت و سیرت اور اعجازات و کمالات کو سن کر رشوت لینا ترک کر دیں؟ کتنے لوگ بے جا نفع اندوزی سے تائب ہوتے ہوں گے؟ کتنے اپنی نگاہوں کے راہواروں کو حرام کی چراگاہ میں داخل ہونے سے باز رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوں گے؟ کتنے حکام و عمال کبر و ظلم کا طریقہ چھوڑ کر عوام سے محبت و خدمت کا طرز عمل شروع کر دیتے ہوں گے؟ کتنے لکھنے والے نطق و بیان کی قوت کو اسلامی اقدار کے خلاف، بیگانہ و منافقانہ نظریات کی سربلندی سے روک لیتے ہوں گے؟ کتنے قوی لوگ ضعیفوں کو تنگ کرنے سے باز آجاتے ہوں گے؟ کتنے شرابی اور جواری شراب اور جوئے سے تائب ہوتے ہوں گے؟ کتنے بے نمازی ایسے مبارک موقعوں کے زیر اثر مسجدوں کی صفوں میں آکھڑے ہوتے ہوں گے؟ کتنے اہل مال اسراف و تبذیر سے پرہیز کا فیصلہ کرتے ہوں گے؟ کتنی بے پردہ خواتین ایک انقلابی جذبے سے برقعہ یا چادر اوڑھ لیتی ہوں گی اور مخلوط مجالس میں شرکت کو ترک کر دیتی ہوں گی؟ کتنے واعظ لوگوں کو بیوقوف بنانے اور بے سند کہانیاں سنانے اور فرقہ وارانہ نزاعات چھیڑنے سے باز آجاتے ہوں گے؟

میں نے اپنی عمر معاشرے میں چل پھر کر گذاری ہے، اور امیروں اور غریبوں، عالموں اور جاہلوں اور حاکموں اور محکوموں کے حالات کو اچھی طرح دیکھا سمجھا ہے۔ میں اپنے مشاہدے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ بالعموم مختلف دینی تقاریب سے بار بار گذرنے کے باوجود جو جہاں ہوتا ہے، وہیں رہتا ہے۔ جس کی جو عادات اور مشاغل ہیں، اُن میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔ بلکہ جو جتنا گیا گذرا ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ دینی تہواروں میں بڑھ کر قدم مارتا ہے۔ بیبوائیں کس جوش سے محرم اور میلاد مناتی ہیں، تارکِ صوم حضرات کس ٹھاٹھ سے عید کا جشن مناتے ہیں۔ حرام کمائیاں کرنے والے کتنا کتنا خرچ کر کے قربانیاں دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے ستمگر حج کر کے پچھلے گناہ بخشوانے اور اپنے زعم سے نیا لائسنس حاصل کرتے ہیں۔

ان گنتی کی مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ دیجیے جو بہر حال کسی بھی تحریک سے نیکی کی جانب جھک جاتی ہیں،

مگر جن کی سلیم الفطرتی عام بگاڑ کے سیلاب کا رُخ موڑنے پر قادر نہیں ہوتی۔ بقیہ اکثریت کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ عین ان مبارک دنوں میں بھی ظلم و گناہ کی درانتی سے حرام کی کھیتیوں سے فصلیں کاٹتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے ایمان خوابیدہ ہیں، اُونگھتے رہتے ہیں، اور کوئی ان کو جگاتا نہیں۔ ایمان ہمیشہ اعلیٰ درجے کے شعور کے ساتھ اُبھرتا ہے، مگر یہاں شعور کی تربیت کا کوئی سر و سامان نہیں ہوتا۔ سارا زور جذباتیت پر ہوتا ہے اور دینِ حق اور اُس کے پہنچانے والے عظیم انسان و پیغمبر سے ہمارا معاملہ رومانی طرز کا رہتا ہے۔

جن طبقوں کا فرض تھا کہ وہ ایمانوں کو جگاتے، شعور کو اُبھارتے اور لوگوں کے دل و دماغ کو ایک انقلابی داعیے سے مالا مال کرتے، اُن میں سے کچھ تو اپنے علم کی بہار دکھانے کے درپے رہتے ہیں، کچھ جذباتی لہریں پیدا کرنے کے ماسوا کچھ نہیں کر سکتے، کچھ لوگوں کو حضورؐ کی شخصیت و سیرت کو ایسی فوق الانسانی عجوبگوں کا مجموعہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ عوام میں جذبۂ طاعت و اتباع پیدا ہو ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اپنی انسانیت کو اپنے ارتفاع میں ناقابلِ عبور رکاوٹ سمجھ کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو حضورؐ کی ذات اور کارناموں کو اپنی مخصوص فرقہ وارانہ رنگین اور محدود عینک سے دیکھنے اور دکھاتے ہیں اور اُن کو سب سے بڑھ کر فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ سامع یا قاری اُن کے فرقے سے چپکا رہے۔ پھر حضورؐ کی شان کو بلند سے بلند تر کر کے دکھانے والے حضرات لوگوں پر یہ اثر ڈالتے ہیں کہ حضورؐ سے نسبت رکھنا اور حضورؐ پر درود بھیجنا حضورؐ کی شفاعت کے لیے کافی و وافی ہے، چاہے معاش و معاشرت کے اعمال و احوال کچھ ہی ہوا کریں۔

اور پھر جدید تعلیم یافتہ حضرات کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو رسولِ برحق کی شان میں فلسفیانہ مقالات لکھ کر اُن کو بھاری بھرکم دانشورانہ اصطلاحات سے آراستہ کر کے تعلیم یافتہ لوگوں سے داد لیتا اور سادہ لوگوں کو مرعوبیت میں ڈال کر چھوڑ دیتا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی ہماری تقاریب و تقاریر اور کانفرنسوں اور جلوسوں پر نمائش کا اتنا تیز رنگ چڑھ گیا ہے کہ اخلاص کی روح کا پتا نشان لگانا مشکل ہو گیا ہے اور ذہنوں میں انقلاب یا کرداروں میں تغیر

پُرزور رُوحِ اخلاص سے کام لیے بغیر نہیں لایا جا سکتا۔

رسولِ خاتم النبیینؐ ایمان اور خُلق کے جس رتبۂ بلند پر فائز ہیں اور جو مقامِ قرب و مقبولیت بارگاہِ الٰہی میں آپؐ کو حاصل ہے، وہ اجمالاً ہر اُس شخص پر واضح ہے جو حضورؐ پر ایمان رکھتا ہے۔ پس ہر سال، ہر جلسۂ سیرت میں اور ہر مسجد کے منبر سے اُس انسانِ اعظم کی رفعتوں کو بیان کرتے رہنا کافی نہیں، اُمّت کو یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اس ہستیٔ مبارک کے ساتھ آپ لوگوں کا تعلق کیا ہونا چاہیے اور حضورؐ کے کون سے حقوق آپ پر واجب آتے ہیں جن کے ادا کرنے سے ایمانی و اخلاقی اور انفرادی و اجتماعی زندگی سنورتی ہے۔ ضرورت اُس ہستیٔ بلند کی رفعتوں کی جانب بڑھنے کی ہے تاکہ ہم نفس پرستی اور دُنیا پرستی کے چکّر سے نکل سکیں۔

یہاں جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ حقوق عرض کیے جاتے ہیں جن کی ادائی کے بغیر دارین کی فلاح و سعادت کا حصول ممکن نہیں۔

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کا پہلا حق ہم پر یہ ہے کہ ہم حضورؐ پر ایمان لائیں۔ اس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں، قرآن اس مطالبے سے بھرا پڑا ہے، اذانوں میں رسالت کی شہادت دی جاتی ہے، اسلام لانے کے لیے شرطِ لازم خدا کی توحید کے ساتھ حضورؐ کی نبوت پر ایمان لانا ہے۔ انہی دو باتوں پر کلمۂ طیبہ مشتمل ہے۔

مگر ایمان کی حقیقت و ماہیت سے عام طور پر ناواقفیت پائی جاتی ہے۔ ایمان صرف زبانی اقرار کا نام نہیں، قلبی تصدیق بھی چاہیے۔ ایمان شعور کا بھی درجۂ کمال ہے اور جذبات کی حرکت بھی رکھتا ہے۔

انسان کی پوری ہستی اور اُس کی جملہ ذہنی و قلبی اور عقلی و جذباتی کیفیات جب کسی حقیقت کی جانب بھرپور طریق سے متوجہ ہو جاتی ہیں تو پھر وہ حقیقی اور مکمل ایمان سے مالا مال ہوتا ہے۔ خوابیدہ ایمان، غیر شعوری ایمان، غیر جذباتی ایمان، گونگا ایمان، تشکیک آلودہ ایمان یہاں مطلوب نہیں ہے، ایسا ایمان مطلوب ہے جو زندگی پر چھا جائے اور تمام معاملات و مسائل کی باگ ڈور سنبھال لے۔

ماننے کی بات صرف اتنی ہی نہیں کہ حضورؐ نبی و رسولؐ تھے یا اور ہیں، بلکہ اس کا لازمی پہلو یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والے کے لیے ہادی، مرشد اور قائد و رہبر ہیں۔ حضورؐ پر ایمان لانے والے کے لیے جائز نہیں رہتا کہ وہ کسی اور کو زندگی کا ہادی و مرشد یا فکری و عملی قائد و رہنما تسلیم کرے۔

ایمان بالرسالت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ محمد رسول اللہ کو آخری نبی تسلیم کیا جائے جن کے آنے سے دین مکمل ہوا، الٰہی نظامِ ہدایت قیامت تک کے لیے ساری انسانیت پر واجب القبول ہوا اور آخری شریعت ایک ایسا وسیع و جامع پیرایہ اختیار کر گئی کہ وہ ہر قسم کے معاشروں میں نافذ ہو کر اُن کو پیش آنے والے نو بنو مسائل کو حل کر سکتی ہے۔

اس ایمان کا ایک لازمی تقاضا رسول اللہ سے محبت رکھنا ہے۔ آدمی جس کسی پر حقیقت میں ایمان لاتا ہے اُس سے محبت کرتا ہے۔ اُس سے بے رُخی اور بے توجہی نہیں برتتا۔ حضورؐ کے اپنے ارشاد کے مطابق آپ سے ایسی محبت رکھنا ہم پر واجب ہے جو ہمارے ماں باپ، اہل و عیال اور مال و منال ہر چیز کی محبت کے مقابلے میں زیادہ زوردار ہو۔ تمام محبتوں پر غالب آجائے۔

منشا یہ ہے کہ جب کسی معاملے میں حضورؐ کے احکام اور اپنے اقرباء و اعزہ کی خواہشات یا مالی مفاد میں تصادم ہو جائے تو حضورؐ کی محبت کی خاطر مقابل کے تمام رجحانات کو قربان کر دینا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔

محبت کی ایک ابتدائی شکل ادب ہے۔ حضورؐ کے ادب کا ایک تقاضا یہ ہے کہ آپ کا نام احتراماً القاب و آداب کے ساتھ لیا جائے۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اُس کے رسولؐ کے سامنے حدِ ادب سے آگے نہ بڑھا جائے۔ (لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ) اُونچی آواز میں حضورؐ کے سامنے بات نہ کی جائے (لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی)۔ ان احکام کا تقاضا آج یہ ہے کہ ہم سب کا مرتبہ خدا کے حضور بندگی کا اور رسول اللہ کے سامنے اطاعت گذار اُمتی کا سا ہونا چاہیے۔ جو کچھ ارشادات اُدھر سے ہوں اُن کے متعلق بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائی جائیں اور بڑے بول نہ بولے جائیں۔ آج حال یہ ہے کہ بعض بدبخت حضورؐ کا یا حضورؐ کی شریعت کا مذاق تک اُڑاتے ہیں، بعض حضورؐ کی ثابت شدہ احادیث کو بے وقعت گردانتے ہیں، بعض بڑی بے باکی سے قرآن و حدیث میں تحریفیں

کرتے ہیں، بعض حضورؐ کو بطور اسوہ و نمونہ قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ خدا کی مرضیات و احکام کے بھی خلاف ہے، اور حضورؐ کے سامنے شدید گستاخی بھی۔ حضورؐ کے سامنے گستاخی کی سزا بربادیٔ اعمال بتائی گئی ہے، یعنی کیا کرایا سب غارت۔

رسولِ برحق کا تیسرا حق جو ایمان اور محبت کا لازمہ ہے، یہ ہے کہ حضورؐ کی اطاعت کی جائے۔ قرآن میں اطاعتِ رسول کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ خدا کی اطاعت کی صورت بھی یہی ہے کہ حضورؐ کی اطاعت کی جائے، کیونکہ آپ کو تمام انبیاء کی طرح امت کے لیے مطاع (واجب الطاعت) ٹھہرایا گیا ہے۔

اطاعت ایک تو اس حیثیت سے کہ رسول خدا ہمارے لیے معلم و مزکی ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت کے سانچے میں ڈھلنا ہم پر واجب ہے۔

دوسری حیثیت حضورؐ کے شارع ہونے کی ہے۔ ہر وہ چیز جسے شریعت کے طور پر آپؐ نے تلقین فرمایا وہ ہمارے لیے اسی طرح واجب الاطاعت ہے جیسے قرآن مجید میں بیان شدہ خدا کے اوامر و نواہی۔

تیسری حیثیت حَکَم ہونے کی ہے۔ یعنی زندگی کا جو بھی جھگڑا اور اختلاف سامنے آئے اُس کا فیصلہ حضورؐ کی تعلیم سے طلب کیا جائے گا۔ بات چاہے نظریاتی بحث و جدال کی ہو، گھریلو اور کاروباری نزاعات ہوں، عدالتی مقدمات ہوں یا اسمبلیوں کی بحثیں، ان سب میں اگر حضورؐ کو حَکَم تسلیم نہ کیا جائے، آپؐ کے اوامر و نواہی کو خوشی خوشی تسلیم نہ کیا جائے۔ اور اُدھر سے جو رہنمائی دی گئی ہو اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر دیا جائے تو سرے سے ایمان ہی کی خیر نہیں۔ (لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم)۔

چوتھی حیثیت شارحِ وحی اور مبیّنِ قرآن ہونے کی ہے۔ یعنی قرآن نے اعلیٰ درجے کے حکیمانہ انداز سے جن حقائق یا احکام کو بیان کیا ہے اُن کی تفصیل نہ صرف زبان سے بتانا بلکہ عمل کر کے دکھانا کہ قرآن کا منشا اس طرح ہے، یہ حضورِ پاک کا مقرر شدہ منصب ہے۔ حضورؐ پر ایمان لانے والے ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ اس منصب کو تسلیم کرے اور دین و شریعت کی حقیقت کو اُسی طرح قبول کرے جیسے حضورؐ نے اُسے پیش کیا، اور اوامر و نواہی پر اسی طرح عمل کرے جس طریق سے حضورؐ

نے عمل کیا۔

پانچویں حیثیت اسوہ و نمونہ ہونے کی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے لیے اپنے رسول کو اسوۂ نمونہ قرار دیا۔ جو اسوہ و نمونہ وہاں سے ملے اس کی پیروی کرنا لازمۂ ایمان ہے۔

چھٹی حیثیت قائد و رہنما کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے مستقل قائد و رہنما ہیں۔ دین کا کام جس طرح آپ نے کیا، اس کے مختلف مراحل سے جس طرح گذرے، زندگی کے مختلف معاملات میں جو رہنمائی آپ نے دی، زندگی کا جو نظام اور اس کے مختلف شعبوں کا جو ڈھانچہ آپ نے قائم کیا اور خدا پرستانہ بنیادوں پر جس نقشے پر ایک جامع تہذیب و تمدن کو استوار کیا۔ یہ سارا کچھ ہمیں اس ایمانی جذبے سے جوں کا توں قبول کرنا ہے کہ اس کی تلقین ہمارے قائد و رہنما نے کی ہے۔

نبی اکرم کو قائد و رہنما ماننے کے بعد، عملاً زندگی کی رہنمائی کی بھیک کسی اور دروازے سے مانگنا یا فکری و عملی دائرے میں باطل کے کسی علمبردار کو قائد و رہنما ماننا یا مسلمانوں میں سے کسی کو یہ درجہ دینا کہ وہ حضورؐ کی تعلیمات میں ردّ و بدل کر سکتا ہے یا وہ بھی ویسی ہی قیادت و رہنمائی کا مقام رکھتا ہے، یہ ساری باتیں ایمان بالرسالت کے خلاف ہیں۔ حضورؐ پر ایمان لانے والے بزرگانِ دین، علماء و مفکرین اور فقہاء و صلحاء کا صرف یہ مقام تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے ذریعہ بنیں حضورؐ کی قیادت و رہنمائی سے استفادہ کرنے کا نیز حضورؐ کی بارگاہِ علم و حکمت تک پہنچانے کا۔

اِن ساری حیثیتوں سے رسول اللہ کی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ جو کوئی دانستہ آپ کی اطاعت کو اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ محبت کے دعوے اگر کرتا ہے تو کھوکھلے دعوے ہیں۔ اس محبت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص صبح سے شام تک کسی آقا کے سامنے اس کی مدح و ستائش کرتا رہے اور "میں قربان، میں قربان" کی رٹ لگائے رکھے، لیکن آقا کی طرف سے اگر کہا جائے کہ ذرا پانی کا ایک گلاس لا دو، تو وہ سُنی اَن سُنی کر دے اور ٹس سے مس نہ ہو۔

ایک شخص اپنے اعتقاد کو وہ شکل نہیں دیتا، جیسی حضورؐ نے مقرر کی، وہ قرآن اور حضورؐ کی تعلیمات سے آگاہی حاصل نہیں کرتا، وہ عبادات کی پابندی نہیں کرتا، وہ حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہے، وہ ادنیٰ ادنیٰ مفادِ دنیوی کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔ وہ مخالفِ اسلام نظریات کا (باقی بر صفحہ ۲۴۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

نوٹ:۔ پچھلی قسط نومبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے

تذکرۂ انبیاء

علیہم السلام

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب سوم ——— حضرت نوح علیہ السلام

فصل ۵

فصل ۵

قومِ نوحؑ کا منکرانہ رویہ

حضرت نوحؑ کے بشر ہونے پر اعتراض

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ	اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا
قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی
يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ	جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے
شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ	اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو
مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا	کبھی ہم نے اپنے باپ دادا سے سنی ہی نہیں (کہ
الْاَوَّلِيْنَ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ	بشر رسول بن کر آئے) کچھ نہیں بس اس آدمی کو ذرا
جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى	جنون لاحق ہو گیا ہے۔ کچھ مدت اور دیکھ لو شاید
حِيْنٍ (المومنون، آیات ۲۴ تا ۲۵)	(افاقہ ہو جائے)

یہ خیال تمام گمراہ لوگوں کی مشترک گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے قرآن نے بار بار اس جاہلانہ تصور کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے اور اس بات کو پورے زور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاء انسان تھے اور انسانوں کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے۔

حضرت نوحؑ پر اعتراض کیا گیا کہ:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اس کی قوم کے سرداروں نے کہا۔ ہمیں تو تم
مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا	اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان
مِّثْلَنَا (ھود۔ آیت ۲۷)	ہو ہم جیسے ....

اس پر حضرت نوحؑ فرماتے ہیں کہ ہاں میں ایک انسان ہی ہوں۔ میں نے انسان کے سوا کچھ اور ہونے

کا دعویٰ کب کیا تھا؟ کہ تم مجھ پر اعتراض کرتے ہو۔ میرا دعویٰ جو کچھ ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ خدا نے مجھے علم و عمل کا سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ اس کی آزمائش جس طرح چاہو کرلو۔ مگر اس دعویٰ کی آزمائش کا یہ کونسا طریقہ ہے کہ کبھی تم مجھ سے غیب کی خبریں پوچھتے ہو اور کبھی ایسے ایسے عجیب مطالبے کرتے ہو کہ گویا خدا کے خزانوں کی ساری کنجیاں میرے پاس ہیں اور کبھی اس بات پر اعتراض کرتے ہو کہ میں انسانوں کی طرح کھاتا پیتا، اور چلتا پھرتا ہوں، گویا میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ جس آدمی نے عقائد، اخلاق اور تمدن میں صحیح رہبری کا دعویٰ کیا ہے اس سے ان چیزوں کے متعلق جو چاہو پوچھو، مگر تم عجیب لوگ ہو جو اس سے پوچھتے ہو کہ فلاں شخص کی بھینس کٹڑا جنے گی یا ؟ گویا انسانی زندگی کے لیے صحیح اصولِ اخلاق و تمدن بتانے کا کوئی تعلق بھینس کے حمل سے بھی ہے

غریبوں کے قبولِ حق پر اعتراض

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا	اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ان لوگوں
الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ	نے بے سمجھے بوجھے اختیار کی ہے جو ہمارے ہاں کے
الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ	اراذل ہیں اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس
عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (ہود۔ آیت ۲۷)	میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو۔

حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ، یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ رہے اونچے طبقے کے با اثر اور خوشحال لوگ، تو وہ ان کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جو دلائل وہ حضرت نوحؑ کے خلاف پیش کرتے تھے، ان میں سے ایک استدلال یہ بھی تھا کہ اگر نوحؑ کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا۔ تو قوم کے امراء، علماء، مذہبی پیشوا، معززین اور سمجھ دار لوگ اسے قبول کرتے۔ لیکن ان میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے۔ اس کے پیچھے لگے ہیں ادنیٰ طبقوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ ان بے شعور ادر کمین لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں؟

اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب، محنت پیشہ اور ادنیٰ درجہ کی خدمات انجام دینے والے ہیں یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ علم و عقل

اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں ، اس لیے نہ ان کا ایمان کسی فکر و بصیرت پر مبنی ، نہ ان کا اعتقاد لائق اعتبار اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن۔

حضرت نوحؑ کا جواب

حضرت نوحؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آکر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے ، اس کے اس فعل کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے ، میرا اور تمہارا کام نہیں ہے۔

ان کی قدر و قیمت جو کچھ بھی ہے وہ ان کے رب کو معلوم ہے اور اسی کے حضور جا کر وہ کھلے گی اگر یہ قیمتی جواہر ہیں۔ تو میرے اور تمہارے پھینک دینے سے پتھر نہ ہو جائیں گے اور اگر یہ بے قیمت پتھر ہیں تو ان کے مالک کو اختیار ہے کہ انہیں جہاں چاہے پھینکے۔

دوسری جگہ اس اعتراض کا ذکر یوں کیا گیا ہے :۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ	"انھوں نے جواب دیا۔ کیا ہم تجھے مان لیں، حالانکہ
الْاَرْذَلُوْنَ (الشعراء۔ آیت ۱۱۰)	تیری پیروی ذلیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے؟"

یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوحؑ کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے اس لیے اونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے نوحؑ کیا تم پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو اراذل اور سفہاء میں شمار کرائیں ؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں اور کام پیشہ لوگوں کی صف میں آ بیٹھیں ؟

حضرت نوحؑ اس کا جواب یہ دیتے ہیں وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء آیت ۱۱۴) میں آخر یہ غیر معقول طرزِ عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھرتا رہوں ؛ اور جو میری بات مانتے ہیں انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بے لاگ آدمی کی ہے جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے۔ اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو

قبول کر کے سیدھے راستے پر آئے۔ اور جس کا جی چاہے۔ آنکھیں بند کر کے تباہی کے رستے پر چلتا رہے۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لیے میرے پاس آئیں۔ ان کی ذات برادری، نسب اور پیشہ پوچھوں اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہوں میں "کمین" ہوں۔ تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ "شریف" حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔[1]

اقتدار طلبی کا الزام

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ (المومنون - آیت ۲۴)

اس کی قوم کے جن سرداران نے ماننے سے انکار کیا تھا وہ کہنے لگے کہ "یہ شخص نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔"

یہ بھی مخالفینِ حق کا قدیم ترین حربہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کے لیے اٹھے۔ اس پر فوراً یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ "کچھ نہیں بس اقتدار کا بھوکا ہے۔" یہی الزام فرعون نے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ پر لگایا تھا "کہ تم اس لیے اٹھے ہو کہ تمھیں ملک میں بڑائی حاصل ہو جائے۔" تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ (یونس۔ ۷۸) یہی حضرت عیسیٰؑ پر لگایا گیا کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور اسی کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سرداران قریش کو تھا، چنانچہ کئی مرتبہ انھوں نے آپ سے یہ سودا کرنے

---

[1] ٹھیک یہی معاملہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں نبیؐ اور کفار مکہ کے درمیان چل رہا تھا اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جا رہی ہے۔ کفار مکہ کے بڑے بڑے سردار نبیؐ سے کہتے تھے کہ آخر بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ جیسے غلاموں اور کام پیشہ لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں۔ تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف ادھر کا رخ کریں۔ ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دو ٹوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی۔ کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکے نہیں دیے جا سکتے۔

کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو "اپوزیشن" چھوڑ کر "حزبِ اقتدار" میں شامل ہو جاؤ، تمھیں ہم بادشاہ بنائے لیتے ہیں۔

دنیا پرستوں کی ذہنیت

اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر دنیا اور اس کے مادّی فائدوں اور اس کی شان و شوکت ہی کے لیے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں، اُن کے لیے یہ تصوّر کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ فلاحِ انسانیت کی خاطر بھی اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ وہ خود چونکہ اپنا اثر و اقتدار جمانے کے لیے دل فریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے دعوے شب و روز استعمال کرتے رہتے ہیں اس لیے یہ مکاری و فریب کاری ان کی نگاہ میں بالکل ایک فطری چیز ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر و فریب کے سوا کسی صداقت اور خلوص کے ساتھ کبھی لیا ہی نہیں جا سکتا، یہ نام جو بھی لیتا ہے ضرور وہ ان کا اپنا ہم جنس ہی ہوگا۔ اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف "اقتدار کی بھوک" کا یہ الزام ہمیشہ برسرِ اقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ گویا خود انھیں اور ان کے آقایانِ نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے۔ اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں وہ کسی الزام کے مستحق نہیں ہیں، البتہ نہایت قابلِ ملامت ہے وہ، جس کے لیے یہ "غذا" پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی "بھوک" محسوس کر رہے ہیں۔ اس جگہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جو شخص بھی رائج نظامِ زندگی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے اٹھے گا، اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریہ و نظام پیش کرے گا، اس کے لیے بہرحال یہ بات ناگزیر ہوگی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سدِّ راہ ہوں انھیں ہٹانے کی کوشش کرے اور ان طاقتوں کو برسرِ اقتدار لائے جو اصلاحی نظریہ و نظام کو عملاً نافذ کر سکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہوگی، اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ لوگوں کا مقتدا و پیشوا بن جائے گا اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوں گی یا اس کے حامیوں اور پیروؤں کے ہاتھ ان پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیاء و مصلحینِ عالم میں سے کون ہے، جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملاً نافذ کرنا نہ تھا اور کون ہے جس کی دعوت کی کامیابی نے فی الواقع اس کو پیشوا نہیں بنا دیا؟ پھر کیا یہ امرِ واقعی کسی پر یہ الزام چسپاں کر دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ دراصل اقتدار کا بھوکا تھا اور اس کی اصل غرض وہی پیشوائی تھی جو اس نے حاصل کر لی؟

ظاہر ہے کہ بدنیت دشمنانِ حق کے سوا اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کے بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصدِ خیر کے لیے مطلوب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی بڑا فرق، جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے نشتر میں ہے۔ اگر کوئی شخص اس بنا پر ڈاکو اور ڈاکٹر کو ایک کر دے کہ دونوں بالارادہ جسم چیرتے ہیں اور نتیجہ میں مال دونوں کے ہاتھوں میں آتا ہے تو یہ صرف اس کے اپنے ہی دماغ کا یا دل کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کی نیت، دونوں کے طریق کار اور دونوں کے مجموعی کردار میں اتنا بڑا فرق ہوتا ہے کہ کوئی صاحبِ عقل آدمی ڈاکو کو ڈاکو اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔

سرداروں کی طرف سے عوام کو بھکانے کی مہم

وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ۔ (نوح ۔ آیت ۲۲) ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے۔

مکر سے مراد ان سرداروں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو حضرت نوحؑ کی تعلیمات کے خلاف بھکانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ نوحؑ تمہیں جیسا ایک آدمی ہے، کیسے مان لیا جائے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے (الاعراف ۶۳ ۔ ہود ۲۷)۔ نوحؑ کی پیروی تو ہمارے اَراذِل نے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان لاتے (ہود ۔ ۲۷)۔ خدا کو اگر بھیجنا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجتا (المومنون ۔ ۲۴)۔ اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے، اس کو علمِ غیب حاصل ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے بے نیاز ہوتا (ہود ۔ ۳۱)۔ نوحؑ اور اس کے پیروؤں میں آخر کونسی کرامت نظر آتی ہے جس کی بنا پر ان کی فضیلت مان لی جائے (ہود ۔ ۲۷)۔ یہ شخص دراصل اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے (المومنون ۔ ۲۴)۔ اس شخص پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے (المومنون ۔ ۲۵)۔

سردارانِ قوم کی دھمکی

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (الشعراء ۔ آیت ۱۱۵) اے نوحؑ اگر تو باز نہ آیا تو پھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا۔

اصل الفاظ ہیں: لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم کو رجم کیا جائے گا یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ تم پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ کی جائے گی، جہاں جاؤ گے دھتکارے اور پھٹکارے جاؤ گے۔ عربی محاورے کے لحاظ سے یہ دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ
إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ
إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ
مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ
اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ
فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَ
شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ
أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ
اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ۝
فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا
سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ
أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۚ وَأُمِرْتُ
أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝
(یونس۔ آیات ۷۱-۷۲)

ان کو نوحؑ کا قصہ سناؤ، اُس وقت جب اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”اے برادرانِ قوم! اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سُنا سُنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے، تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو۔ اور جو منصوبہ تمہارے پیشِ نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے، پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہ تھا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں۔“

خواہشِ عذاب

قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا
فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا
تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝
(ھود۔ آیت ۳۲)

آخرکار ان لوگوں نے کہا ”اے نوحؑ! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، اگر سچے ہو۔“

اضافی نوٹ از مرتبین:۔

جدال یا جھگڑے سے مراد حضرت نوحؑ کی طرف سے قوم کے گمراہانہ رویّے پر وہ بحثیں اور گفتگوئیں ہیں جو ہر داعیِ اصلاح کو کرنی پڑتی ہیں اور جو ہمیشہ اصلاح ناپذیر لوگوں کو ناگوار گزرتی ہیں جب کبھی کسی معاشرے میں کوئی شخص بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے کے لیے اٹھتا ہے تو اس کی دعوت ہر طرف ایک ذہنی

تدوجزر پیدا کر دیتی ہے۔ لوگوں کی مجالس میں دن رات گفتگوئیں ہونے لگتی ہیں اور آبادی میں ایک تصادم برپا ہو جاتا ہے۔ پہلے بے سے کے امتیاز کے بغیر زندگیاں گزارنے والے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم امن چین سے تھے کہ خواہ مخواہ کا ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ اسی احساس سے قوم نوحؑ کے سرداروں نے حضرت نوحؑ پر اعتراض کیا کہ تم نے ہمارے ساتھ ایک بحثا بحثی اور ایک جھگڑا شروع کر کے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ اب تم وہ عذاب ہی لے آؤ جس کا ہمیں ڈراوا دیتے ہو تاکہ کسی طرح یہ قضیہ ختم ہو۔

عذاب الٰہی کا اس بے خوفی سے مطالبہ کرنا درحقیقت یہ معنی رکھتا ہے کہ مطالبہ کرنے والوں کو سرے سے اس بات کا یقین ہی نہیں کہ عذاب آ سکتا ہے، ورنہ وہ حضرت نوحؑ کی دعوت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔

عذاب جن قوموں پر بھی آیا ہے انھوں نے خود عذاب کو دعوت دی ہے۔ یہی حضرت نوحؑ کی قوم نے بھی کیا۔ قوم نوحؑ نے پہلے اعتراضات اٹھائے، پھر دھمکی دی، پھر عذاب کی خواہش کی۔ نتیجہ یہ کہ عذاب آکے رہا۔

پتہ لکھیں

ایک رفیق نے مہاجرین فنڈ کے لیے مبلغ اسی (۸۰) روپے ایڈیٹر ترجمان القرآن کی معرفت بھجوائے ہیں۔ کوپن پر انہوں نے پتہ نہیں لکھا۔ اب براہ کرم وہ پتہ سے مطلع کریں، تاکہ رسید بھجوائی جاسکے۔

(ادارہ)

امام ابوبکرؒ خطیب بغدادی

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

نام و نسب — احمد نام، ابوبکر کنیت، خطیب لقب[۱]۔

ولادت — امام ابوبکر خطیب ۲۴ جمادی الثانی ۳۹۲ھ کو عراق کے قریہ درزیجان میں پیدا ہوئے، مگر آپ کی نشوونما بغداد میں ہوئی۔ اسی لیے "بغدادی" کے نام سے مشہور ہوئے[۲]۔

تحصیلِ تعلیم — جب ہوش سنبھالا تو تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے، اور آپ نے اپنے وقت کے نامور علماء و فضلاء، محدثین عظام اور فقہائے کرام سے تفسیر، حدیث، تاریخ، ادب، فقہ، اصولِ فقہ، معقول و منقول، غرضیکہ ہر فن میں بدرجۂ کمال علم حاصل کیا۔ تحصیلِ علم کے لیے بصرہ، کوفہ، نیشاپور، اصفہان، ہمدان، مکہ، مدینہ اور دمشق وغیرہ کا سفر کیا۔ اور ان شہروں کے اساطین فن سے کسبِ فیض کیا۔ اور آپ کو مطالعہ کا اتنا شوق تھا کہ راستہ چلتے ہوئے کتاب کے مطالعہ میں مشغول رہتے[۳]۔

حدیث میں درجہ و مرتبہ — حدیث میں امام خطیب کا شمار اعلیٰ پایہ کے محدثین میں ہوتا ہے۔ علمائے فن

---

[۱] ابن خلکان جلد ۱، ص ۳۶

[۲] معجم البلدان جلد ۴، ص ۵۳

[۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳، ص ۳۳۶

نے ان کے حفظ وضبط، ثقاہت واتقان اور روایت و درایت میں اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

جن اساطین نے امام کی ثقاہت اور حفظ وضبط کا اعتراف کیا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں:۔

ابوسعد بن سمعانی، ابوالعینان رواسی، ابن ماکولا، ابوعلی یزدانی، ابواسحاق شیرازی، علامہ ابن صلاح، امام نووی، علامہ ابن کثیر، ابن خلکان، ابن جوزی، حافظ ذہبی، علامہ ابن سبکی۔[1]

دوسرے فنون میں مہارت امام ابوبکرؒ خطیب جس طرح حدیث میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے، اسی طرح فقہ، تاریخ، قرأت، علم القرآن اور شعر وادب میں ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں اُس وقت کے علماء وفضلاء نے اُن کی علمیت کا اعتراف کیا ہے۔

علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ وہ اصلاً فقیہہ تھے۔ لیکن فن حدیث و تاریخ سے ان کو زیادہ سروکار رہا۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تاریخ میں ان کا مقام اس شعر کے مطابق تھا جو انہی کے متعلق کہا گیا ہے:۔

مازلت تدأب فی التاریخ مجتهداً
حتی رأیتك فی التاریخ مکتوباً

امام ابن جوزی فرماتے ہیں کہ ادب کے واقف کار اور اچھے شاعر تھے اور فنِ قرأت وتجوید اور علوم قرآنی میں بھی ممتاز تھے۔[2]

فضل وکمال علمی حیثیت سے خطیب کا پایہ بہت بلند تھا۔ اسی کے ساتھ اُن میں شان وشوکت، ظاہری وجاہت اور رعب وداب بھی تھا۔ بڑے وقار، متانت اور سنجیدگی سے رہتے تھے۔ زہد و تقویٰ میں بھی نمایاں تھے، نماز وتلاوتِ قرآن سے بڑا شغف تھا۔ انفاق فی سبیل اللہ کا بھی بہت ذوق تھا۔ مستجاب الدعوات بھی تھے۔[3]

فقہی مسلک فقہی مسلک کے لحاظ سے شافعی المذہب تھے۔ عقیدہ مذہب اشعری پر کاربند تھے۔

---

[1] تذکرۃ المحدثین جلد ۲، ص ۳۸۷ [2] ایضاً ص ۴۹۱

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳، ص ۳۳۴

جیسا کہ ابن عساکر نے اس کی تصریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "وکان یذھب فی الکلام الی مذھب ابی الحسن الاشعری"۔ (ترجمہ) وہ کلام وعقیدہ میں مذہب اشعری پر کاربند تھے[1]۔

ابتلاء وآزمائش امام ابوبکر خطیب کے زمانہ میں اسلامی ممالک، خصوصاً بغداد میں سخت خلفشار اور ہیجان برپا تھا۔ ایک طرف شیعی وسنی تصادم اور مختلف فقہی مذاہب کے ماننے والوں کے باہمی اختلافات نے ملتِ اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کر دیا تھا۔ اور دوسری طرف حکام وامراء کے اقتدار کی باہمی کشمکش اور افتراق نے حکومت وسلطنت کے نظام کو تہ وبالا کر دیا تھا۔

ان حالات میں خطیب امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل پیرا ہوئے، جس کی پاداش میں وہ مصائب وآلام اور شدائد ومحن میں مبتلا ہوئے۔ علاوہ ازیں آپ کے شافعی المذہب ہونے اور اس کے ساتھ متکلمین واشاعرہ سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے حنابلہ نے آپ کو زدوکوب بھی کیا[2]۔

وفات رمضان المبارک ۴۶۳ھ میں بیمار ہوئے۔ اور آخر ۷ ذی الحجہ کو ۷۱ سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ جنازہ میں ایک جمِ غفیر شریک تھا۔ آپ کے استاد ابو اسحاق شیرازی بھی آپ کو کندھا دینے والوں میں شامل تھے۔ جب آپ کا جنازہ اٹھا تو ایک جماعت یہ منادی کر رہی تھی کہ:۔

"یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سینہ سپر ہو کر آپ کی طرف سے کذب وافتراء کی تردید کرتا تھا، اور آپ کی حدیثوں کو یاد کرتا تھا[3]۔"

تصنیفات خطیب کی تصنیفات کی تعداد ایک سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ان میں بہت سی معدوم اور نایاب ہیں۔ ان کی اکثر کتابیں فنونِ حدیث سے متعلق گوناگوں مسائل ومباحث اور مفید ومتنوع معلومات پر مشتمل ہیں۔

امام ابن جوزی امام خطیب کی تصانیف کے نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"جو شخص ان کا بغور مطالعہ کرے گا وہ خطیب کی قدر وعظمت اور عدیم المثال

---

[1] تبیین کذب المفتری ص ۲۷۱

[2] تذکرۃ المحدثین جلد ۲، ص ۲۹۹ [3] ایضاً ص ۲۹۹

کارنامے کا اعتراف کرے گا۔ انہوں نے ایسا عظیم الشان علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، جو اُن سے پہلے کے اور اُن سے فائق محدثین و ائمہ مثلاً دارقطنی وغیرہ بھی ایسی خدمت انجام نہیں دے سکے[1]

امام ابوبکر کی معلوم کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ ابطال النکاح بغیر ولی۔ ۲۔ الاسماء المتواطئۃ والانساب المتکافئۃ۔

۳۔ امالی الخطیب۔ ۴۔ بیان اہل الدرجات العلیٰ۔

۵۔ کتاب التبیین اسماء المدلسین یا کتاب اسماء المدلسین۔

۶۔ کتاب بسملۃ وانہا جزء من الفاتحۃ۔ بعض لوگوں نے اس کا نام "نہج الصواب فی ان البسملۃ من فاتحۃ الکتاب" بھی لکھا ہے۔

۷۔ کتاب الجہر ببسملۃ ۸۔ کتاب التفصیل المبہم المراسیل یا کتاب مبہم المراسیل۔

۹۔ کتاب تمییز المزید فی متصل الاسانید ۱۰۔ کتاب التنبیہ والتوقیف علی فضائل الخریف۔

۱۱۔ کتاب الاجازۃ للمعلوم والمجہول یا اجازۃ المجہول والمعلوم۔

۱۲۔ کتاب الاحتجاج بالشافعی فیما سند الیہ والرد علی الطاغین لعظیم جہلہم علیہ۔

۱۳۔ جزء وحدیث اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبہ۔ ۱۴۔ جزء وحدیث الامام ضامن والموذن مؤتمن۔ ۱۵۔ جزء وحدیث السنۃ من التابعین وطرقہ واختلاف وجوہہم۔ ۱۶۔ جزء وحدیث طلب العلم فریضۃ۔ ۱۷۔ جزء وحدیث النزول۔ ۱۸۔ جزء وحدیث عبدالرحمان بن سمرۃ وطرقہ۔ ۱۹۔ کتاب الدلائل والشواہد علی صحۃ العمل بخبر الواحد۔ ۲۰۔ کتاب الرحلۃ، یا الرحلۃ فی طلب الحدیث۔ ۲۱۔ کتاب الرواۃ عن مالک۔ ۲۲۔ کتاب الروایات الصحابۃ عن التابعین۔ ۲۳۔ کتاب الروایۃ الابناء عن الاباء یا کتاب روایۃ الاباء عن الابناء۔ ۲۴۔ کتاب السابق واللاحق۔ ۲۵۔ کتاب الاسماء والالقاب۔ ۲۶۔ صلوٰۃ التسبیح والاختلاف فیہا۔ ۲۷۔ کتاب صوم یوم الشک یا کتاب النہی عن صوم یوم الشک۔ ۲۸۔ کتاب طرق حدیث قبض العلم ۳ مجلدات ہیں۔ ۲۹۔ عوالی مالک بن انس۔ ۳۰۔ کتاب غسل الجمعۃ ۳ مجلدات ہیں۔

---

[1] المنتظم جلد ۸ ص ۲۶۶

۳۱۔ کتاب الفصل الوصل والمورخ فی النقل۔ ۳۲۔ کتاب المفقیہ والمتفقہ۔ ۳۳۔ کتاب المفنون یا کتاب الفنون۔ ۳۴۔ الفوائد الصحاح والغرائب۔ ۳۵۔ القضا بالیمین مع الشواہد۔ ۲ مجلدات ہیں۔ ۳۶۔ کتاب القنوت والآثار المرویۃ فیہ۔ ۳ مجلدات ہیں۔ ۳۷۔ کتاب القول فی النجوم یا کتاب القول فی علم النجوم۔ ۳۸۔ کشف الاسرار۔ ۳۹۔ کتاب المتفق والمفترق۔ ۴۰۔ کتاب المسلسلات الرباعیات ۲ مجلدات ہیں۔ ۴۱۔ مسند ابی اسحاق الشیبانی ۳ مجلدات ہیں۔ ۴۲۔ مسند ابی بکر الصدیق علی شرط الصحیحین ۴۳۔ مسند ابان بن بشر۔ ۴۴۔ مسند صفوان بن سلیم۔ ۴۵۔ مسند صفوان عسانی۔ ۴۶۔ مسند محمد بن حجارۃ۔ ۴۷۔ مسند محمد بن سوقۃ۔ ۴۸۔ مسند مسعر بن کدام یا مسند مطر الوارق۔ ۴۹۔ مسند نعیم بن حماد الغطفانی۔ ۵۰۔ کتاب معجم الرواۃ عن مالک۔ ۵۱۔ کتاب معجم الرواۃ عن شعبۃ۔ ۵۲۔ کتاب المکمل فی بیان المہمل۔ ۵۳۔ مناقب احمد بن حنبل۔ ۵۴۔ مناقب الشافعی۔ ۵۵۔ کتاب من حدث ونسی۔ ۵۶۔ کتاب من وافقت کنیۃ اسم ابیہ مما لا یومن وقوع الخطاء فیہ۔ ۵۷۔ کتاب الموضح یا کتاب موضح اوہام الجمع والتفریق۔ ۵۸۔ الاسماء المبہمہ فی الانباء المحکمہ۔ ۵۹۔ کتاب النجلاء تین مجلدات ہیں۔ ۶۰۔ کتاب تقیید العلم۔ تین مجلدات ہیں۔ ۶۱۔ کتاب الحیل۔ تین مجلدات ہیں۔
۶۲۔ کتاب رافع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والالقاب، یا کتاب مقلوب الاسماء۔
۶۳۔ کتاب المؤتلف والمختلف۔ ماخوذ از "المؤتلف والمختلف فی اسماء الرجال" از امام دارقطنی
۶۴۔ کتاب المؤتنف تکملہ کتاب المؤتلف والمختلف۔ ۶۵۔ کتاب اقتضاء العلم۔
۶۶۔ کتاب الجامع فی ادب الراوی والسامع، یا کتاب الجامع الاخلاق الراوی وآداب السامع۔
۶۷۔ کتاب التطفیل، یا کتاب الطفلین۔ ۶۸۔ کتاب شرف اصحاب الحدیث۔ [1]
۶۹۔ کتاب غنیۃ المقتبس فی تمییز الملتبس۔ ۷۰۔ کتاب تلخیص المتشابہ فی الرسم وحمایۃ ما اشکل منہ عن نوادر التصحیف والوہم۔ ۷۱۔ کتاب الکفایہ۔ ۱۳ اجزاء ہیں۔

[1] جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم مولانا محمد جونا گڑھی مرحوم ایڈیٹر اخبار محمدی دہلی نے ۱۳۴۵ھ میں حج بیت اللہ کے سفر میں مدینہ کے نسخہ سے اس کتاب کی نقل حاصل کی ہے اور اسے محبوب المطابع دہلی سے شائع کیا۔ (مؤلف مضمون)

مصطلحاتِ حدیث میں بڑی اہم کتاب ہے۔ اس میں روایات و احادیث کے اصول و ضوابط کے متعلق اصحابِ فن اور محدثین کے اقوال سنداً بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی جامعیت و اہمیت کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

"مصطلحاتِ حدیث میں قاضی ابو محمد نے سب سے پہلے المحدث الفاصل لکھی، لیکن اس میں استیعاب سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ابو عبداللہ حاکم کی تصنیف ہے۔ لیکن یہ مہذب و مرتب نہیں۔ ابو نعیم نے حاکم کی کتاب کا مستخرج لکھا۔ لیکن اس میں بھی آئندہ آنے والوں کے لیے بعض چیزیں چھوڑ دی گئی ہیں۔ ان لوگوں کے بعد خطیب نے قوانینِ روایت میں کفایہ اور آدابِ روایت میں الجامع الآداب الراوی والسامع لکھی۔ حدیث کے متعلق شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں اس کی علیحدہ تصنیف نہ ہو۔ ابوبکر بن نقطہ کا بیان ہے کہ جو شخص انصاف سے ان کی کتابیں پڑھے گا، اس کو معلوم ہوگا کہ خطیب کے بعد کے محدثین ان کی کتابوں کے محتاج ہیں۔"

اس کا گراں قدر نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے ۱۳۵۷ھ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ تصحیح و مقابلہ کا کام مولانا سید ہاشم ندوی مرحوم نے اپنے بعض رفقاء کی معاونت سے انجام دیا۔[1]

۳۔ تاریخ بغداد | امام ابوبکر خطیب کی یہ سب سے ضخیم اور شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ امام ابن خلکان فرماتے ہیں۔ "اگر خطیب اس کتاب کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ لکھتے تو تنہا یہی کتاب ان کے فخر و شرف اور فضل و کمال کے لیے کافی تھی"۔ اس کتاب سے ان کے علمی تبحر، دقتِ نظر اور وسیع مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ امام خطیب کو خود بھی اس کتاب پر ناز تھا۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ مکہ معظمہ میں زمزم کا پانی پی کر خدا سے تین باتوں کی دعا کی:۔

اوّل یہ کہ میری کتاب تاریخ بغداد کو شرفِ قبول اور حسنِ اعتبار حاصل ہو۔

دوسرے بغداد کی جامع منصور میں سب سے عمدہ اور مقدس جگہ میں حدیث کی تعلیم و املاء میں مشغول

---

[1] تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ص ۳۰۵۔

رہنے کی مجھ کو توفیق میسر آئے۔ اور آخری یہ دعا یہ تھی کہ بشر حافی کی قبر کے متصل ان کے پہلو میں دفن کیا جاؤں۔

خدا نے ان کی تینوں دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا[۱]۔

بغداد کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں۔ خطیب کو اولیت کا شرف حاصل نہیں، تاہم جو مقبولیت اور شہرت خطیب کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ خطیب اس کے موضوع و محتویات کے بارے میں خود لکھتے ہیں:۔

"یہ کتاب مدینۃ السلام (بغداد) کی تاریخ ہے۔ اس کی آبادی اور تعمیر کا ذکر اور یہاں کے مشاہیر و اعیان، وارد بن علماء فضلاء کا تذکرہ ہے"[۲]

دوسری جگہ اس کی نوعیت و ترتیب کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس میں دارالسلام بغداد کے خلفاء، اشراف، اکابر، قضاۃ، فقہاء، محدثین، قراء، زہاد، صلحاء اور ارباب شعر و ادب کا ذکر ہے، جو لوگ یہاں پیدا ہوئے، یا پیدا تو کسی دوسری جگہ ہوئے، لیکن یہاں سکونت اختیار کر لی، یا جو یہاں کی سکونت ترک کر کے دوسری جگہ فوت ہوئے، یا دوسرے مقامات کے جو لوگ یہاں آئے، ان سب کا نیز بغداد کے مقامات اور نواح کے رہنے والوں کا اس میں تذکرہ ہے۔ ان کی کنیت، حسب و نسب، ان کے مشہور واقعات، مناقب و فضائل، مدت عمر، تاریخ وفات اور عام حالات، غرض ان لوگوں کے بارے میں جو روایتیں بزرگوں سے محفوظ و منقول چلی آرہی تھیں، سب جمع کر دی گئی ہیں۔ خواہ ان کا تعلق مدح و قبول اور تعدیل سے ہو، یا ذم و قدح اور جرح سے۔ ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے۔ لیکن جن لوگوں کا نام محمد ہے۔ ان کا تبرک کے خیال سے میں نے پہلے تذکرہ کیا ہے"[۳]

امام خطیب نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حالات و واقعات، روایت و اسناد کے ساتھ لکھے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۳

[۲] تاریخ بغداد جلد ۱ ص ۳ [۳] ایضاً جلد ۱ ص ۲۱۲ - ۲۱۳ -

ہیں۔ اس کے اسلوب و طریقۂ بیان کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم لکھتے ہیں،

" تاریخ خطیب جس طرح بہترین زمانہ کی تاریخ ہے، اسی طرح طرز بیان کے لحاظ سے مسلمان مؤرخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ الفاظ بقدر معانی استعمال کیے ہیں۔ عبارت آرائی، مدح طرازی کا نام نہیں۔ بیان صاف اور متین ہے۔ جرح و تعدیل دونوں بے لاگ ہیں۔ اگرچہ بعض معرکۃ الآرا مقامات میں قوتِ فیصلہ کی کمی نمایاں ہے۔ محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغے اور منطقیانہ تذبذب کا اثر نہیں" [1]

تاریخ بغداد صرف رجالِ بغداد کا ترجمہ و تذکرہ ہی نہیں ہے، بلکہ رجال کے حالات کے ضمن میں علمی دقائق اور مجتہدانہ مباحث بھی محدثانہ قوت کے ساتھ حل کیے گئے ہیں۔ صاحب کشف الظنون کہتے ہیں

" اس میں محدثین کے انداز اور طریقہ کے مطابق بغداد کے رجال و واردین کا تذکرہ اور دیگر بے شمار فوائد شامل کیے ہیں اس لیے یہ کتاب نہایت ضخیم اور پُر منفعت ہوگئی ہے" [2]

بغداد کے لوگوں کے تذکرہ کی ابتداء تبرکاً محمدؐ کے نام سے کی ہے اور سب سے پہلے محمد بن اسحاق صاحب سیرۃ کا تذکرہ کیا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ ان سے زیادہ کوئی کبیر السن، عالی الاسناد اور قدیم العہد شخص نہ تھا۔

تاریخ بغداد ۱۹۳۱ء مطابق ۱۳۴۹ھ میں مصر سے ۱۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۷۸۳۱ مشاہیر رجال کا جو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، تذکرہ ہے۔ رجال کی فہرست اور صفحے پر سطروں کا شمار بھی دیا گیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۶۷۹۱ ہے۔ اس میں فہرست کے صفحات بھی شامل ہیں۔ [3]

تاریخ بغداد کے ذیول | اس تاریخ کی اہمیت کی وجہ سے اس کے متعدد ذیول لکھے گئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ امام ابوسعد عبدالکریم سمعانی (م ۵۶۲ھ) کی کتاب الانساب ۱۵ جلدوں میں۔

---

[1] معارف جلد ۳۲، عدد ۲ ص ۱۰۸

[2] کشف الظنون جلد ۱ ص ۲۲۱

[3] تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ص ۳۰۹

۲۔ عماد الدین ابو عبد اللہ محمد بن حامد (م ۵۹۷ھ) سمعانی کے ذیل پر ذیل۔ ۳ جلدوں میں۔

۳۔ ابو عبد اللہ محمد بن سعید المعروف بابن الدثینی (م ۶۳۷ھ)۔ سمعانی کے ذیل پر اضافہ۔

۴۔ ابن قطیعی نے ابن الدثینی کے ذیل پر ایک ضمیمہ لکھا۔

۵۔ حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے ابن الدثینی کے ذیل کی تلخیص لکھی جس کا نام "المختصر المحتاج الیہ من تاریخ بغداد" رکھا۔

۶۔ حافظ محب الدین محمد بن محمود المعروف بابن النجار بغدادی (م ۶۴۳ھ) نے سب سے ضخیم اور طویل ذیل لکھا جو ۳۰ جلدوں میں ہے۔

۷۔ تقی الدین محمد بن رافع (م ۷۷۴ھ) ابن النجار کے ذیل پر ذیل لکھا۔

۸۔ ابوبکر مارستانی نے ابن النجار کے ذیل پر ذیل لکھا۔

۹۔ تاج الدین علی بن انجب شاعر بغدادی نے ابوبکر مارستانی کے ذیل پر ذیل لکھا۔

۱۰۔ ابوالیمن مسعود بن محمد بخاری (م ۴۶۱ھ) نے تاریخ کا مختصر خلاصہ لکھا۔

۱۱۔ امام محمدی۔ مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد جوناگڑھی (م ۱۹۴۵ء) ایڈیٹر اخبار محمدی دہلی نے تاریخ بغداد سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ترجمہ و سوانح حیات کا حصہ علیحدہ کر کے اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۴۵ھ میں دہلی سے شائع کیا تھا۔ یہ رسالہ امام صاحب کے ردّ و قدح اور مناقب و مثالب دونوں پر مشتمل ہے [1]

---

[1] تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ۔ ص ۳۱۰

بلاسودی بنک کاری

اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ

نفع و نقصان میں مُنصفانہ حصّہ داری

اسلامی نظریاتی کونسل

اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ بسلسلہ بلاسود بنک کاری میں بہت سے ضروری مباحث شامل ہیں۔ مقاماتِ اختلاف کے باوجود بہت سا مواد مفید اور قابلِ قدر ہے۔ اس میں سے ایک اقتباس مندرجہ بالا عنوان سے منتقل دیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

اسلام صاحبِ زر اور کاروباری فریق میں جس نوعیت کا تعلق پیدا کرتا ہے اُس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اگر کاروبار میں نفع ہو تو تمام فریق منصفانہ طور پر اس کے حصّہ دار بنیں اور اگر خسارہ ہو تو اُس میں بھی سب اس طرح شریک ہوں کہ جس طرح نفع میں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ۔ (سورۃ النساء آیت ۲۹)

ترجمہ:۔ (اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں۔)

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ کسی دوسرے شخص کا مال ناجائز طریقے جیسے سود، قمار یا دھوکہ سے ہتھیانا حرام ہے۔ اس کے برعکس باہمی رضامندی اور منصفانہ معاملے کے ذریعے ایک دوسرے کے مال و دولت سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔

کاروبار کا لازمی عنصر یہ ہے کہ اس میں جو سرمایہ لگایا جاتا ہے اس پر منافع کا انحصار کاروبار کی

عملی کارکردگی پر ہوتا ہے۔ اگر اس اصول کا اطلاق کاروبار کے جدید طریقوں اور سرمایہ کاری پر کیا جائے تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ بنکوں کے موجودہ طریق کار کو از سر نو منظم کیا جائے اور سود کے بجائے نفع نقصان میں شرکت کا اصول اختیار کیا جائے۔ نفع نقصان میں شرکت کے اصول پر بنک اور دیگر مالیاتی ادارے کاروبار میں جو سرمایہ لگائیں گے، اس پر انہیں مقررہ شرح پر سود نہیں ملے گا بلکہ وہ اس ادارے کے نفع نقصان میں حصہ دار ہوں گے جسے مالی وسائل فراہم کریں۔ اس طرح جو لوگ اپنی بچتیں کسی خاص مدت کے لیے بنکوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں جمع کروائیں گے وہ بنک کے نفع نقصان میں شریک ہوں گے۔ مقررہ شرح سے سود کے بجائے نفع نقصان میں شرکت کا اصول رائج کرنے کے نتائج بہت دوررس ہوں گے اور اگر اس اصول پر کامیابی سے عمل ہوا تو اس سے معاشرتی عدل کے قیام میں مدد ملے گی، جو ہر اسلامی معاشرے کا اوّلین اور بنیادی مقصد ہے۔

اگرچہ اسلامی شریعت کی رُو سے نفع نقصان میں شرکت کا اصول جائز ہے اور سودی نظام کے جو لوازمات ہیں اُن کے ناپسندیدہ ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ متعدد اسباب کی بنا پر سجاناتِ موجودہ نفع نقصان میں شرکت کے اصول کی کامیابی کے بارے میں بہت سے شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے اس تردد کی چند وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

نفع و نقصان میں شرکت کے نظام کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ بنک یا کسی اور مالی ادارے سے جو کاروباری ادارہ بھی سرمایہ حاصل کرے وہ ایمانداری کے ساتھ اور ٹھیک طرح سے حسابات مرتب کرے تاکہ کاروبار کی کارکردگی کا صحیح نقشہ واضح ہو سکے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ زیادہ تر کاروباری ادارے یا تو سرے سے حساب کتاب ہی نہیں رکھتے یا غلط طریقہ پر رکھتے ہیں اور یا پھر بیک وقت کئی کئی حسابات رکھتے ہیں، جو مختلف مقاصد کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کمپنیوں تک کے حسابات میں بھی جنہیں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ آڈٹ کرتے ہیں، کاروبار کی صحیح کارکردگی ظاہر نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ ادارے نفع کو دبا کر اور نقصان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات تو فرضی نقصان دکھا دیتے ہیں۔ جن طریقوں سے یہ ہیر پھیر کیا جاتا ہے ان میں بعض کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

ا۔ سال کے شروع میں مال کی قیمت بڑھتی ہوئی دکھاتے ہیں اور اختتام سال پر مال کی

قیمت کم دکھاتے ہیں۔

۲ ـــ اثاثوں کی قیمت خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تاکہ فرسودگی کی مد میں زیادہ رقم منہا ہو سکے اور اس طرح نفع کی مد میں یا تو کچھ ظاہر نہ ہو یا پھر نفع کم ہو جائے۔

۳ ـــ ڈائریکٹروں کے مشاہرے اور اجرتیں بہت زیادہ دکھائی جاتی ہیں اور یہ حضرات اکثر صورتوں میں کاروبار کرنے والوں کے عزیز و اقارب ہی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں حسابات کی جانچ پڑتال سے نفع و نقصان کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ تنقیح کنندہ حضرات اصولی اور قانونی ضوابط کی پابندی کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کھاتوں میں مصارف کے اندراجات درست ہیں یا غلط۔

آج کل یہ سارا ہیر پھیر ٹیکس سے بچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تاجر حضرات یہ دلیل دیتے ہیں کہ وہ ٹیکس وصول کرنے والے اداروں میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کی وجہ سے دو کھاتے رکھنے پر مجبور ہیں۔ صورت جو بھی ہو اس وقت ہمارا جو اخلاقی معیار ہے اس کے پیش نظر اگر نفع نقصان میں حصہ داری کا نظام نافذ کر دیا گیا اور بنکوں اور مالی اداروں نے اس نظام کو اپنا لیا تو کھاتے داروں کی یہ بدعنوانیاں اور بھی زیادہ بڑھ جائیں گی۔ بلکہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان مالیاتی اداروں کے افسران اور کاروباری حضرات اپنی ملی بھگت قائم کر لیں۔ کیونکہ اس وقت بھی ان اداروں میں بہت سی بدعنوانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ نفع نقصان کی تقسیم میں اس ناجائز آمدنی کے حصول کے مواقع زیادہ وسیع ہوں گے۔ اس لیے اندیشہ یہ ہے کہ ملی بھگت کرنے کی تحریک زیادہ بڑھ جائے گی۔

قابلِ عمل طریقہ

نفع نقصان میں شرکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کا کوئی ایسا قابل عمل طریقہ دریافت کرنے کی غرض سے، جو ہمارے حالات سے مطابقت رکھتا ہو، کونسل نے ان تمام فقہی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، جو شرکت و مضاربت کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ جہاں تک معاہدۂ شرکت کی شرائط کا تعلق ہے، اُن کی رُو سے کاروبار میں شریک تمام فریق یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ منافع کی تقسیم کے لیے، اس امر کا لحاظ کیے بغیر کہ کاروبار میں ان کے لگائے ہوئے سرمائے کا تناسب کیا ہے، کسی بھی نسبت پر اتفاق کر لیں۔ لیکن جہاں تک نقصان کا تعلق ہے اس کی تقسیم سختی کے ساتھ

اس سرمایے کے تناسب سے ہوتی ہے جو انہوں نے کاروبار میں لگایا ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ نفع نقصان میں شرکت کے مجوزہ نظام میں اس امر کا فیصلہ کہ مالیاتی اداروں اور تجارتی و صنعتی فرموں کے درمیان منافع کی تقسیم کس نسبت اور شرح سے ہو، متعلقہ فریقوں کی صوابدید پر نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اس کے انضباط کا فریضہ مرکزی بنک کے سپرد ہونا چاہیے تاکہ ایک تو مالیاتی اداروں کے درمیان غیر صحت مندانہ رقابت کا سدباب ہو .... نئے نظام میں متعلقہ فریقوں کے درمیان استعمالات کے لیے وسائل پیداوار کی تخصیص کے عمل کو قومی ترجیحات کی تقسیم کا عمل ان کے لگائے ہوئے سرمایے کے تناسب سے جاری رہے گا لیکن جہاں تک بنکوں اور مالیاتی اداروں کا تعلق ہے، انہیں عام طور پر یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے ہوئے سرمائے کے مطابق منافع کی رقم میں حصہ دار بنیں۔ بلکہ ان کا حقیقی حصہ ان نسبتوں کے مطابق ہوگا جن کا تعین مرکزی بنک کرے۔ مثال کے طور پر کسی کاروبار میں کسی بنک کا منافع اس کے لگائے ہوئے سرمایے کے مطابق سَو روپے ہے اور نفع کی نسبت کا تعین کرنے والے ادارے نے 50 : 5 کی نسبت مقرر کی ہے تو اس صورت میں بنک کو جو منافع ملے گا اس کی مقدار پچاس روپے ہوگی تاہم جہاں تک نقصان کا تعلق ہے اس کی تقسیم سختی کے ساتھ کاروبار میں لگائے ہوئے سرمایے کے تناسب سے کی جائے گی۔

نفع نقصان کی تقسیم کے لیے فراہم کی جانے والی رقم کو اتنے دنوں سے ضرب دیا جائے گا، جتنے دنوں سرمایہ استعمال میں رہا، چاہے وہ کاروباری ادارہ کے حصے کا سرمایہ ہو یا اس کی فاضل نقدی ہو یا بنک کا قرضہ ہو اور یا بنک کی فراہم کی جانے والی رقم ہو جو کاروبار میں کام آئے۔ اس طرح ایک مشترکہ نسبت نما حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ تمام فریقوں کے حصے کے سرمایے کا حساب یومیہ حاصل ضرب کی بنیاد پر لگایا جائے گا۔ اس عمل میں پہلے سے بڑا جز بھی حاصل ضرب کا حساب لگانے کے لیے اس مدت سے تجاوز نہیں کرے گا جس کا حساب لگایا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہی وہ مدت ہے جس میں عملی طور پر رقم لگی رہی اور کاروبار پر اثر انداز رہی۔ کاروباری اداروں سے معاملہ کرتے وقت بنک کے لیے ایک ایسی شق معاہدہ میں درج کرنا ہوگی جس کی رو سے اسے

اپنی طرف سے ایک ڈائریکٹر مقرر کرنے کا اختیار ہو جو اس ادارے میں بنک کے مفاد کی حفاظت کرے۔ بنک کو یہ اختیار بھی ہو گا کہ اس کاروبار کے سلسلے میں جس میں اس نے رقم لگائی ہے، حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرے اور کاروبار کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرے۔

جہاں تک لمیٹڈ کمپنیوں سے بنکوں کے لین دین کا تعلق ہے، بنکوں کی ذمہ داری صرف اس رقم کی حد تک محدود ہو گی جو انہوں نے مالی امداد کی صورت میں فراہم کی ہے۔ لیکن اگر بنک افراد، شراکتی کاروبار یا دوسرے ایسے اداروں کو سرمایہ فراہم کریں گے جن کی ذمہ داری غیر محدود ہو تو بنکوں کی ذمہ داری بھی غیر محدود ہو گی۔ تاہم ایسی صورتوں میں بنک یہ پابندی لگا سکتے ہیں کہ دوسرا فریق بنکوں کی سرمایہ کاری کے دوران میں کوئی مزید مالی ذمہ داری قبول نہیں کرے گا اور یہ کہ اگر بنکوں کی منظوری کے بغیر ایسی کوئی ذمہ داری قبول کی گئی تو بنک اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

چند ضروری تحفظات | ۱۔ کونسل کا خیال ہے کہ تعزیری سود کی جگہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنا نہایت ضروری ہے جو شریعت کے مطابق بھی ہو اور لوگوں کو بروقت ادائیگی پر مجبور بھی کر سکے۔ اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ ادا نہ کرنے یا تاخیر کی شکل میں جرمانہ عائد ہونا چاہیے جو ایک خاص مدت تک بڑھتا رہے۔ لیکن جرمانے کی رقم بنک کے بجائے حکومت کے خزانے میں جمع ہونی چاہیے تاکہ یہ سود کی شکل نہ اختیار کرنے پائے۔ تاخیر اور نادہندگی اگر بغیر معقول وجہ کے ہو تو یہ نہ صرف خیانت ہے بلکہ نئے نظام کو ناکام بنانے کے مترادف ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسا کرنے والوں کو سخت ترین سزا دی جائے جس میں ان کے مال کی ضبطی بھی شامل ہو۔ ساتھ ہی ایسے لوگوں کو بلیک لسٹ کر دینا چاہیے تاکہ یہ آئندہ کسی بنک سے روپیہ نہ لے سکیں۔

۲ — نئے نظام کی کامیابی کے لیے بنکوں کو یہ آزادی دینا ضروری ہے کہ وہ خالص کاروباری اصولوں اور بینکنگ کے معیارات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس فریق کی مالی امداد کی درخواست مناسب سمجھیں، منظور کریں اور جس کی نامناسب سمجھیں مسترد کر دیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ سرکاری شعبہ میں چلنے والے بہت سے کاروباری ادارے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں...... چنانچہ انہیں یا تو مسلسل نقصان ہو رہا ہے یا پھر برائے نام

فائدہ اس کے باوجود بنکوں کو سرکاری ہدایات کے ذریعہ مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان اداروں کی مالی ضروریات پوری کریں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اوپر بنکوں کے واجبات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

۳ — نئے نظام کی کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ حسابات کی جانچ پڑتال کے نظام میں بنیادی اصلاحات کی جائیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل انتظامات قابلِ غور ہیں:-

ا — مالی اداروں کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ جس کاروباری ادارہ کو رقم فراہم کریں۔ اس کے حسابات کی تنقیح کے لیے اپنے تنقیح ساز مقرر کر سکیں۔ اس سے تنقیح سازوں میں تحفظ کا احساس بھی پیدا ہوگا۔ اور وہ اپنے فرائض کی ادائیگی بھی آزادی سے کر سکیں گے۔

ب۔ بنکوں سے مالی امداد کے طلب گار اداروں کے لیے ضروری کیا جائے کہ وہ لاگت کے تعین کا نظام قائم کریں اور اس کی تنقیح بھی کرائیں۔ اب تک زیادہ تر کمپنیاں ایسا نہیں کرتیں۔ چنانچہ تنقیح سازوں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ مصنوعات پر مختلف قسم کے کیا کیا مصارف کیے گئے ہیں۔

ج — مالی اداروں کے تنقیحی شعبہ کو بہت اچھی طرح سے منظم کیا جائے تاکہ یہ دوہری جانچ کر کے اپنا اطمینان کر لیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ کاروباری ادارے اپنے ریکارڈ سلیقہ سے رکھیں گے اور ہر تیسرے یا چھٹے مہینے حاصل ہونے والے نفع کے بارے میں زیادہ صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

د۔ انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹینٹس کو تنقیح سازوں کی دورانِ کار تربیت کے کورس شروع کرنے چاہئیں تاکہ انہیں یہ ملکہ حاصل ہو جائے کہ وہ نفع چھپانے کے حسابی حیلوں سے واقف ہو جائیں۔

س — انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹینٹس کو غیر سودی معیشت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک نئے تنقیحی نظام کو دریافت کرنے کے لیے تحقیق کرنا چاہیے۔ اس پر جو مصارف آئیں وہ حکومت اور مالی ادارے دونوں مل کر برداشت کریں۔

(باقی بر صفحہ ۴۰)

اسلامی کونسل کے دو مسودہ ہائے قانون

مرکز علوم اسلامیہ منصورہ کی کمیٹی کا تبصرہ

(۱) مسودۂ قانونِ شفعہ

سیکرٹری کمیٹی کا خط :-

بخدمت جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمن صاحب چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللہِ ۔ بحوالہ آپ کے نوٹیفکیشن نمبر ۳ (۲۲) /۸۰ آر سی آئی آئی مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء جس کے ذریعے مسودہ آرڈر ۱۹۸۰ء صدر مملکت کی منظوری سے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا گیا ۔ اس پر تبصرہ ارسال خدمت ہے ۔

مرکز علوم اسلامیہ منصورہ جہاں دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کو سہ سالہ نصاب سے گذار کر درجہ تخصیص کی تحصیل کرائی جاتی ہے، کے اساتذہ کرام مولانا قاضی عبدالرزاق خلیق صاحب اور شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک صاحب نے مولانا ملک غلام علی صاحب سابق معاون خصوصی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور، کی صدارت میں تین چار روزہ اجلاس میں شفعہ آرڈر ۱۹۸۰ء کے مسودہ کا بدقتِ نظر جائزہ لیا ۔ راقم الحروف محمد اسلم سلیمی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ نے اس کمیٹی کے سکرٹری کے طور پہ کام کیا ۔ اس کمیٹی کی رائے حسب ذیل ہے :-

کمیٹی کی رائے میں یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے دو اہم قوانین ــــــ

(پنجاب ایکٹ شفعہ مجریہ ۱۹۱۳ء (ایکٹ نمبر ۱ آف ۱۹۱۳ء) اور شمال مغربی صوبہ سرحد ایکٹ شفعہ مجریہ ۱۹۵۰ء (ایکٹ نمبر ۱۴ آف ۱۹۵۰ء) کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے میں بہت محنت سے کام لیا ہے اور بڑی حد تک ان قوانین کو قرآن وسنت پر مبنی اصولوں کے مطابق بنا دیا ہے۔ یہ کام لائقِ تحسین وستائش ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کونسل کے کارپردازوں کو جزائے خیر سے نوازے!

کمیٹی کی رائے میں یہ بات بھی پسندیدہ ہے کہ اس مسودے کو رسمی قانون بنائے جانے سے پہلے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا گیا ہے۔ یہ بات کونسل کی عالی ظرفی اور عالمانہ احتیاط و انکسار کی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک اچھی مثال ہے اور اگر اس مثال کو آئندہ کے لیے نظیر بنا لیا جائے تو اس کے اچھے نتائج مرتب ہوں گے اور اس طرح جو قوانین نافذ کیے جائیں گے ان کو ایک حد تک رائے عامہ کی تائید و حمایت اور اہل علم کا اعتماد حاصل ہوگا۔ البتہ کمیٹی کی رائے میں پندرہ دن کی میعاد بہت کم ہے۔ خاص طور پر جب کہ اس مسودے کی نقول ہر جگہ بآسانی میسر نہیں ہوتیں۔ اس کمیٹی کو اس کا تجربہ ہوا اور اسلام آباد اپنے ایک آدمی کو بھیجنے اور وہاں سے خاص طور پر ان کو لے کر آنے کا انتظام کرکے اس مسودہ کی نقول اس کمیٹی کو ۲۴ دسمبر کو مل سکیں۔ اور اس پر غور اور اس کے جائزے کے لیے عملاً صرف تین دن ہی مل سکے۔ اس لیے کمیٹی کی رائے میں آئندہ اس مدت کو کم از کم ایک ماہ رکھا جاتے تو بہتر ہوگا اور مسودہ کی نقول کم از کم صوبائی صدر مقام سے تو مل جانی چاہییں۔

نیز یہ امر بھی بے حد قابل قدر ہے کہ مسودہ ہائے قانون کی نقول ملک کی قومی زبان میں بھی مہیا کی گئی ہیں۔

کمیٹی کے ارکان نے شفعہ آرڈر ۱۹۸۰ء کی ایک مرتبہ تو انفرادی طور پر خواندگی کی۔ دوسری مرتبہ اجتماعی خواندگی کی گئی اور وہ چیزیں نوٹ کی گئیں جن پر فقہی کتب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔

اس کے بعد ارکانِ کمیٹی نے فقہ کی متعلقہ کتابوں کا تحقیقی مطالعہ کرکے ان کتابوں کی موجودگی میں تیسری مرتبہ خواندگی کی اور درج ذیل نتیجے پر پہنچے۔

کمیٹی کی رائے میں یہ مسودہ بڑی حد تک فقہ اسلامی کے مطابق ہے۔ صرف ایک دفعہ نمبر ۱۷

فقہ حنفی کے خلاف محسوس ہوتی ۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ چونکہ پاکستان میں مسلمان شہریوں کی اکثریت حنفی المسلک ہے اس لیے قانونِ ملکی میں فقہ حنفی کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے ۔ فقہ حنفی کی رو سے شفیع کی موت (قبل از فیصلہ مقدمہ) سے حق شفعہ زائل ہو جاتا ہے ۔ اس لیے کمیٹی کی رائے میں دفعہ ۱۷ کو تبدیل کر کے اس طرح کیا جائے ۔

دفعہ ۱۷ ۔ شفیع کی موت کا اثر | اگر شفیع مقدمہ شفعہ کا فیصلہ ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو حقِ شفعہ باطل (زائل) ہو جائے گا کیونکہ یہ حق ذاتی ہے اور وراثت یا کسی اور کسی طریقے سے قابل انتقال نہیں ہے ۔ البتہ مقدمہ کا فیصلہ ہو جانے کے بعد شفیع کی موت سے حق شفعہ باطل نہیں ہوگا ۔ اور اس کے قانونی اور جائز ورثاء اجرائے ڈگری کرا سکیں گے ۔

لیکن بائع یا مشتری کی موت سے شفعہ باطل نہیں ہوگا ۔ اور ان کے ورثاء کو ان کے جانشین بنا لینے سے مقدمہ چلتا رہے گا ۔ (ملاحظہ ہو ہدایہ : کتاب الشفعہ ۔ باب ما یبطل بہ حق الشفعہ)

اس بڑی ترمیم کے علاوہ کمیٹی کی رائے میں چند جزوی اور لفظی ترامیم کی بھی ضرورت ہے ۔

۱ ۔ دفعہ ۲ " تعریفات " کی شق ج ۔ حق شفعہ کی تعریف میں آخر میں ..... " بذریعہ بیع حاصل کرنے کا " کے بعد " ترجیحی " کے الفاظ شامل کر لینے سے مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا ۔ اس صورت میں یہ فقرہ یوں ہو جائے گا ۔

...... بذریعہ بیع حاصل کرنے کا ترجیح استحقاق رکھتا ہے ۔

۲ ۔ دفعہ ۳ " توضیح " کی عبارت کا مفہوم درست ہی نہیں لائق تحسین ہے ۔ البتہ اس کے آخر میں ...... " اسلامی اصولوں سے رہنمائی حاصل کریں گی جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں " ... کے بجائے اگر " پر مبنی ہیں " کر لیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی ۔ " مذکور ہیں " کے الفاظ کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن یا حدیث میں سے نص صریح پیش کی جائے ۔ " پر مبنی ہیں " ۔ کے الفاظ سے قرآن و سنت سے مستنبط احکام فقہ بھی پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ اور شفعہ کے معاملے میں اکثر و بیشتر احکام اصولِ فقہ ہی سے لیے گئے ہیں ۔

۳ ۔ دفعہ ۶ کی تشریح میں نمبر ۳ پر " شفیع جار " کی تشریح میں کچھ الجھاؤ سا معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو کمیٹی کی رائے میں یوں لکھا جائے تو بات واضح ہو جائے گی ۔

" شفیع جار " وہ شخص کہلاتا ہے جس کی مملوکہ جائیداد ، مشفوعہ غیر منقولہ جائیداد سے متصل ہو اور اُسے اس بنا پر شفعہ کا حق حاصل ہو۔

۴ ـــ دفعہ ۱۳ " حق شفعہ کے مطالبات " کی تشریح میں نمبر (۳) پر طلب اشہاد کی جو صورت بیان کی گئی ہے اس کی زبان میں بھی الجھاؤ معلوم ہوتا ہے ۔ کمیٹی کی رائے میں اس کو درج ذیل صورت میں بیان کر دینے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔

دفعہ ۱۳ ۔ تشریح (۳) | اگر کسی شفیع نے ضمنی دفعہ (۲) کے تحت طلب مواثبت کیا ہو تو وہ اس کے بعد امکانی حد تک کوئی تاخیر کیے بغیر طلب اشہاد کرے گا جس کی صورت یہ ہو گی :

۱ ۔ اگر جائیداد مبیعہ بائع کے قبضے میں ہو تو بائع کے پاس جا کر ..... یا

۲ ۔ بصورتِ دیگر مشتری کے پاس جا کر ..... یا پھر

۳ ۔ دو سچے گواہوں کی موجودگی میں جائیداد کی جائے وقوع پر طلب اشہاد کرے گا۔

(ملاحظہ ہو ہدایہ ۔ کتاب الشفعہ ۔ باب طلب الشفعہ)

۵ ـــ دفعہ ۱۴ " سرپرست یا کارندہ کی طرف سے مطالبات کی تکمیل میں " میں " ناکام رہے " کے الفاظ مناسب معلوم نہیں ہوتے ۔ ان کی جگہ " کے قابل نہ ہو " کے الفاظ تحریر کر دیے جائیں تو مفہوم بہتر طور پر واضح ہو جائے گا ۔

اس دفعہ کی عبارت یوں پڑھی جائے :۔

۱۴ ۔ اگر کوئی شخص دفعہ ۱۳ کے تحت مطالبات پورے کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کی طرف سے اس کا سرپرست یا کارندہ مطلوبہ مطالبات پورے کر سکتا ہے ۔

۶ ـــ دفعہ ۱۶ " شفعہ کے ذریعے حاصل کردہ اراضی میں لفظ " اسے " کے بجائے " شفیع کو " لکھ دیا جائے تو بات واضح ہو جائے گی ۔

۷ ـــ دفعہ ۲۷ ۔ " فروخت ہائے کی صورت میں برائے اغراض دعویٰ قیمت کا تعین کرنا " کے الفاظ میں بھی کچھ الجھاؤ سا معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو دور کرنا ضروری ہے ۔ کمیٹی کی رائے میں اس دفعہ کو یوں تحریر کرنا مناسب ہو گا ۔

۲۷ (۱) اگر مقدمہ شفعہ کی بنیاد کوئی بیع ہو اور اس صورت میں فریقین مقدمہ قیمت فروخت

پر متفق نہ ہوں تو عدالت پہلے یہ طے کرے گی کہ آیا بیع نامے یا دیگر کاغذات میں درج قیمت نیک نیتی سے مقرر یا ادا کی گئی ہے یا نہیں اور اگر عدالت یہ محسوس کرے کہ یہ قیمت نیک نیتی سے طے یا ادا نہیں کی گئی تھی تو عدالت فریقین سے قیمت کے مسئلے پر شہادت طلب کرے گی اور منجملہ دوسری شہادت کے عدالت کے سامنے بازاری قیمت جائیداد کے سلسلے میں قرائن کی شہادت بھی پیش کی جا سکے گی۔

۸۔ (الف) دفعہ ۳۳ - "دعویٰ شفعہ کی میعاد سماعت" کی شق ج میں صرف بیع کی صورت میں مشتری کے قبضہ کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ ہبہ بالعوض یا بشرط عوض کی صورت کا ذکر اس میں نہیں ہے۔ (حالانکہ ہبہ بالعوض یا بشرط العوض کو بیع کی تعریف میں شمار کیا گیا ہے)۔

لہٰذا دفعہ ۳۳ کی شق ج میں درج ذیل عبارت کا اضافہ کیا جائے گا" ہبہ بالعوض یا ہبہ بشرطیکہ العوض کی صورت میں وہ تاریخ شمار ہوگی جس تاریخ پر ہبہ کے دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو مکمل قبضہ دے دیا ہو"

(ب) دفعہ ۳۳ کی شق (د) میں "اسے" سے مراد سمجھ میں نہیں آتی - اسے کے بجائے مشتری / بائع کے الفاظ لکھنے مناسب ہوں گے - اس شق کی عبارت پر ازسرِ نو غور فرما لیا جائے اور براہ کرم اسے بالوضاحت لکھا جائے۔

۹۔ دفعہ نمبر ۳ - "آرڈر ہذا کی دفعات سے ملتے جلتے ذیلی امور" میں جو اصول دیا گیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ لیکن اس دفعہ میں بھی دفعہ نمبر ۳ کی طرح " قرآن و سنّت میں مذکور ہیں" کے بجائے "قرآن و سنّت پر مبنی ہیں" کے الفاظ درج کر لیے جائیں تو بہتر ہوگا۔

کمیٹی مکرر یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ جرائم خلاف جسم انسانی (نماز قصاص و دیت) کے آرڈی ننس ۱۹۸۰ء کے مسودۂ قانون پر تبصرہ کرنے کی مدت میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ:-

الف - اس مسودہ کی نقول بڑی مشکل سے ۲۴ دسمبر کو ملی ہیں اس لیے یہ وقت بہت مختصر ہے۔

ب - یہ قانون بہت اہم ہے اور مسودۂ قانون بہت ضخیم ہے۔ اس وجہ سے یہ مزید مہلت کا متقاضی ہے۔ اگر مزید پندرہ دن کی مہلت مل جائے تو کمیٹی اس پر اچھی طرح غور کر کے اپنی تجاویز پیش کر سکتی ہے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ - محمد اسلم سلیمی - سیکرٹری کمیٹی -

(باقی)

رسائل و مسائل

فرقہ بندی کا توڑ

(ادارہ)

سوال:- میں چاہتا ہوں کہ فرقہ بندی کے توڑ میں ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں آیاتِ محکمات کو واضح طور پر علیحدہ اس طور سے ترتیب دیا جائے کہ اُن کا محکمات ہونا واضح کیا گیا ہو، اور پھر متشابہات کو بھی اسی طرح بالوضاحت علیحدہ بیان کیا جائے۔ طرزِ بیان اور اسلوبِ وضاحت ناصحانہ اور مصلحانہ ہو، نہ کہ مناظرانہ۔

جواب:- محترم بھائی! شاید آپ کا خیال ہے کہ قائدینِ تفرقہ نے کتاب و سنت کے احکام کو سامنے رکھ کر فرقے بنائے ہیں، اور اب اگر ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن و حدیث تفرقہ بازی کے خلاف ہیں تو وہ فوراً اتحاد و ائتلاف کے راستے پر پڑ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہے اور نہ انہیں کوئی غلط فہمی ہے۔ فرقے بنائے بغیر ان کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ سب نے الگ الگ باڑے بنا لیے ہیں، ان میں اپنے اپنے ریوڑ محفوظ کر رکھے ہیں اور اپنے اپنے فرقے کے مخصوص کلامی علائم اور فقہی شعائر کی باڑیں تعصب کے بندھنوں سے باندھ رکھی ہیں۔ ہر گلہ بان اپنے ریوڑ کو برسوں اس بات کی تربیت دیتا ہے کہ وہ صرف اس کی بات سنے اور کسی دوسرے باڑے سے یا کھلے میدان سے اگر سو فیصد حق و صداقت کی آواز اٹھے تو بھی اسے نہ مانے کہ اس باڑے سے باہر کوئی شخص نہ صحیح العقیدہ ہے نہ صحیح العمل۔

ہر فرقے والا اپنے بزرگوں اور ہم مسلکوں کے افکار و اعمال کا گرویدہ رہتا ہے، اور اس حلقے سے باہر کے اچھے سے اچھے مسلمانوں کے افکار و اعمال میں کھوٹ نکالتا ہے تاکہ کہیں اپنے ریوڑ میں خلل نہ پیدا ہو جائے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو جو قرآن لائے وہ دعوتِ حق کے اس نمایاں نتیجے کو بیان کرتا

ہے کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔ دین کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ مختلف قبیلوں اور نسلوں اور ملکوں کے لوگوں کو بھائی بھائی بناتا ہے۔ پھر قرآن ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان رشتۂ اخوت کا کئی بار ذکر کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ "بنیانٌ مرصوص" بن کر رہیں اور نبی اکرمؐ اتحاد کو لازمۂ ایمان قرار دیتے ہیں۔ (لَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا)۔

بلاشبہ تحریر و تقریر کے وسائل سے بھی امت کو دعوتِ وحدت دینی چاہیے، مگر فرقہ وارانہ تعصبات کا مرض اتنا ہٹیلا ہے کہ اوّل تو فرقوں سے وابستہ افراد کسی بیرونی چیز کو پڑھیں گے ہی نہیں، اور جو اہم شخصیتیں پڑھیں گی وہ اس میں سے کچھ ٹیڑھ نکال کر اپنے لوگوں کو ڈرا دیں گی کہ ایمان میں خلل کا خطرہ ہے اور آخرت میں نقصان کا۔ بلکہ قائل کے منشا کے خلاف مفہوم کسی عبارت سے نکال لینا، کسی ادھوری بات کو سلسلۂ کلام سے منقطع کر کے اس سے ایک نتیجہ برآمد کرنا، حتیٰ کہ لفظی تحریف کر لینا بھی رائج و متداول ہے۔

اندریں حالات بڑی سے بڑی تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ جو لوگ اتحادِ مسلمین کے علمبردار ہوں، وہ ایک تو خود کسی فرقے کی سطح پر نہ رہیں، دوسرے فرقہ وارانہ بحثوں میں نہ پڑیں، حتیٰ کہ دوسروں کی اکساہٹ پر بھی ایسا جواب یا ردِّعمل پیش نہ کریں جس کا مزاج فرقہ وارانہ ہو۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں اصولی طور پر دین کے حقائق بیان ہونے چاہییں۔ کسی فرقے سے تعرض کے طور پر نہیں۔ اگر دوسرے لوگ اپنی نمازیں اور مسجدیں الگ کرتے ہیں تو ان کی روش کے مطابق اپنی نمازیں اور مسجدیں الگ نہ کی جائیں۔ اسی طرح دنیوی علائق کو بھی منقطع نہ کیا جائے۔

اتحادِ مسلمین کے لیے علمبردار اگر ایک طرف یہ ثابت کر دیں کہ وہ ایمان و اعتقاد، حکمت و بصیرت، عمل و کردار اور خدمت و ایثار میں بلند درجہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف سلیم الطبع افراد کو چھانٹ چھانٹ کر ان سے افہام و تفہیم کے انداز پر کئی قسطوں میں دین اور مقاصدِ دین اور وحدتِ ملت پر گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رکھیں تو ان کی مخلصانہ مساعی کو بارآور ہونے سے فرقوں کی باڑیں روک نہیں سکیں گی۔

اس مقصد کے لیے خاص طور پر ایسے مواقع بہت مفید ہو سکتے ہیں، جب اہم تر دینی مفاد یا قومی معاملات سب کو مل کر کام کرنے پر مجبور کر دیں۔ ایسے مرحلوں میں جبکہ اتحاد کی ضرورت کا

احساس موجود ہوتا ہے اور عملاً فرقوں سے بالاتر ہو کر کام کیا جا رہا ہوتا ہے، اسلامی وحدت و اخوت کی تلقین کے بہترین راستے کھلتے ہیں۔

بڑی بیماری یہ ہے کہ ہماری قوم اختلاف کرنے کا صحت مندانہ اسلوب اختیار نہیں کر سکی۔ اختلافِ رائے ہمیشہ تیز و تند انداز میں ہوتا ہے۔ اور اگر حل نہ ہو سکے تو فریقین ایک دوسرے کو کافر اور فاسق و فاجر کہنے لگیں گے۔ مخالف کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کا عقیدہ ٹھیک نہیں، وہ وہابی ہو گیا ہے یا بدعتی ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں، اس کا نکاح باطل ہو گیا۔ اس کی اولاد جائز اولاد نہیں ہے، اس سے لین دین یا بات چیت کرنا حرام ہے، جو مسلمان اس کا ساتھ دے گا یا حمایت کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا اور اس کا نکاح بھی ٹوٹ جائے گا۔ یعنی سارے علمِ فقہ کو اس کے خلاف استعمال کر ڈالا جائے گا، جس نے مولوی صاحب کے قول و فعل سے اختلاف کرنے کا جرم کیا ہے۔

پس ایک تو ہماری قوم کو آدابِ اختلاف سکھانے کی ضرورت ہے اور دوسرے "اتحاد باوجود اختلاف" کی تربیت دینے کی۔

اس کام کے لیے کوئی ایک کتاب کام نہیں دے سکتی، بہت کچھ لکھنے اور بہت سا کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۲)

د۔ حکومت کو ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دینا چاہیے جو موجودہ کمپنیوں کے قانون، چارٹرڈ اکاؤنٹینسی، انکم ٹیکس کے قانون اور سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج آرڈیننس اور دیگر متعلقہ قوانین کا جائزہ لے اور موجود تنقیحی نظام کو غیر سودی بنک کاری کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی کو یہ بھی طے کرنا چاہیے کہ اگر کسی شخص کے خلاف نفع کو چھپانے کی دانستہ کوشش پکڑی گئی تو اس کے خلاف کس نوعیت کی قانونی کارروائی کس طرح کی جائے۔

مطبوعات

اصولِ وراثت، ترکہ
مؤلف: مولینا محمد خلیل اللہ ربانی
ناشر: ادارۂ تعلیم و تصنیف سلیم آباد خیرپور میرس۔ سندھ
سائز ۱۸×۲۳ صفحات ۱۲۸
ٹائیٹل دبیز کمرشل آرٹ پیپر
کتابت و طباعت مناسب
قیمت: دس روپے

اسلام کا قانونِ وراثت اسلامی معاشرے میں روزمرہ بکثرت استعمال ہونے والا قانون ہے۔ مگر یہ اپنی ٹیکنیکل تفصیلات کی وجہ سے خاصا پیچیدہ بھی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو مسائل میراث میں زکوٰۃ سے بڑھ کر ریاضی کو استعمال کرنا پڑا اور انہوں نے اس زمانے میں کسور کے حساب سے کام لیا۔ مفتیانِ دین اور اساتذہ میں سے ہر دور میں بعض اصحاب اس مضمون میں تخصص کا مقام حاصل کرتے رہے ہیں۔ اسلامی مدارس کے درس نظامی میں علم ترکہ کا مضمون شامل ہے۔ یہ کتاب ان مدارس کے طلبہ کی سہولت کے لیے اردو میں لکھی گئی ہے اور مؤلف نے افادۂ عام کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ امید ہے کہ یہ وکلا، ادارہ عملۂ مال اور عدالتوں کے لیے بھی ممد ہوگی۔ مولینا محمد خلیل اللہ صاحب نے نظامِ وراثت کو فقہ حنفی کے مطابق مرتب کیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک اچھی خدمت ہے۔

اس مختصر کتاب میں اسلامی قانونِ میراث کے تحت ضروری احکام اور انطباقات بیان ہوگئے ہیں اور مولانا محمد خلیل اللہ ربانی نے کسی پہلو سے کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ۱۵ ابواب اور خاتمے کے صفحات میں تمام امکانی مستحقینِ وراثت کے حصص مختلف صورتوں میں بتائے گئے ہیں، اور آخر میں ایک ایسا نقشہ بھی شامل کتاب ہے جس کے ذریعے کسی بھی خاص رشتے کے استحقاق کو بیک نظر جانا جاسکتا ہے اور دو مختلف مستحقین کے حصص کو تقابلاً سمجھنا بھی آسان ہے۔

مجھے مولینا محمد خلیل اللہ ربانی کا یوں بھی بڑا احترام ملحوظ ہے، پھر مفتی محمد جمیل صاحب (خیرپور میرس سندھ) کے منظوم تاثرات کے علاوہ مفتی سید سیاح الدین صاحب کاکاخیل کا لکھا ہوا پیش لفظ جب یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ کتاب شرعی احکام کے سمجھنے کے لیے "ہر پہلو سے بے نظیر اور منفرد ہے" تو میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ ایسے عامی قلم کش کے لیے کوئی حرفِ تنقید کہنے کی گنجائش ہی نہیں۔ مگر ترجمان القرآن میں جس طرح کے مختصر تعارفی نوٹ کتابوں پر لکھے جاتے ہیں، ان میں کچھ نہ کچھ مشورہ دینے کی راہیں نکلتی ہیں۔

مفتی سیاح الدین صاحب نے اس کتاب کا یہ مدعا بھی نمایاں کیا ہے کہ کم اردو پڑھے لکھے لوگ بھی بڑی آسانی کے ساتھ دینی مسائل سیکھ سکیں۔ مگر میں عام اردو خواں طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولینا محمد خلیل اللہ ربانی کی تحریر پر اصطلاحات کا بوجھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لیے میں بطور مثال اوّلین مختصر جملے کو پیش کرتا ہوں جس میں ترکہ کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ جملہ یہ ہے کہ "ترکہ یا میراث وہ مال ہے (عین یا دین) جسے کوئی انسان مرتے وقت چھوڑتا ہے۔" عین یا دین میں سے اگر ۲۰ فی صد اصحاب کو دین کے معنی معلوم نہ ہوں گے تو عین کا مفہوم ۸۰ فی صد کے پلّے نہ پڑے گا۔ یعنی بہت سے قاری پہلے ہی فقرے میں اُلجھ گئے۔ جملے کے آس پاس کسی نوٹ کی صورت میں یا کسی حاشیے کے پیرائے میں عین و دین کی کوئی وضاحت نہیں ہے۔ دین کا ترجمہ موجود ہے۔ "عین" کا مفہوم ادا کرنے والا کوئی لفظ تجویز کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو سرسری سی مثال تھی۔ آگے صفحوں کے صفحے ایسے ہیں کہ جن میں کوئی جملہ بھاری بھرکم اصطلاح سے خالی نہیں ہے حالانکہ بہت سی اصطلاحات کے نئے ترجمے ہو جانے چاہئیں۔ یہ تو درست ہے کہ باب کے شروع میں متعلقہ اصطلاحات کے مطالب بیان کر دیے گئے ہیں مگر "مقر له بالنسب علی الغیر" جیسی اصطلاحوں کا تشریح کے باوجود استعمال متن کو بھاری بنا دیتا ہے۔ اسی طرح میرا ایک مشورہ یہ ہے کہ میراث میں استعمال ہونے والی ریاضی کو نئی شکل دی جانی چاہیے جو زمانۂ حاضر میں زیادہ قابلِ فہم ہے۔ جدید نظامِ کسور اور اعشاری حساب بلکہ الجبرا تک کو میراث کی ریاضی پر منطبق کرنا چاہیے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ریاضی کے درسی نصابات میں میراث کے حساب کو بھی شامل کیا جاسکے گا۔

میرا ایک مشورہ یہ بھی ہے کہ کتاب کے اوّلین باب میں قانونِ وراثت کے اساسی اصول قرآن و حدیث کے نصوص کے ساتھ بیان کیے جانے چاہییں، اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں پر جو روشنی ڈالی جاسکتی ہو، وہ ڈالی جانی چاہیے۔ مثلاً اوّلاً یہ اصول کہ میراث کے حقوق خدا کے عطا کردہ حقوق ہیں یا یہ کہ حق داروں کے

کے حصّوں کی کمی بیشی کے اسرار و رموز کو وہی جانتا ہے کہ کیوں کسی کو زیادہ اور کسی کو کم حصّہ ملنا چاہیے اور کسی کو محروم و محجوب رہنا چاہیے یا یہ کہ ایک ہی رشتے کے مردوں اور عورتوں کے لیے حصص کی نسبت ۲ : ۱ ہے یا یہ کہ میراث کا ایک اصول "الاقرب فالاقرب" ہے۔ یعنی جو جتنا قریبی ہے اتنا ہی وہ استحقاق میں آگے ہے۔ پہلے درجے کا قریبی موجود نہ ہو تو دوسرے درجے کا لیا جائے گا وغیرہ۔

پھر چونکہ بعض دوسرے ممالک میں بھی اور خصوصیت سے ہمارے یہاں یتیم پوتے کے حق وراثت کا مسئلہ متجددین کی طرف سے بڑے زور سے اٹھایا جاتا رہا ہے اور موجودہ عائلی قوانین پر بھی اس کی چھاپ ہے، اس لیے ایک مستقل باب میں اس مسئلے پر ایسی مدلل بحث کرنے کی ضرورت تھی کہ جو طلبہ اسے پڑھ کر نکلیں وہ پیش آنے والی بحثوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

اگر ان مشوروں میں سے کسی کو جناب مؤلف پسند کریں تو اگلا ایڈیشن نئی شکل میں مرتب کر سکتے ہیں۔

الامام ابوالاعلیٰ المودودیؒ

تالیف : مولینا خلیل حامدی

ناشر : مکتبۃ العلمیہ۔ لاہور۔ پاکستان

صفحات : ۱۷۱

قیمت درج نہیں۔

عربی میں لکھی ہوئی یہ کتاب مولینا مودودیؒ کی سوانح، دعوت اور جدوجہد کو واضح کرتی ہے۔ برادرم خلیل حامدی رئیس دارالعروبہ (لاہور) جہاں اپنے ذاتی مطالعۂ دین اور عربی زبان میں مہارت کی وجہ سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں، وہاں سید مودودیؒ کے ساتھ بطور سیکرٹری (شعبہ عربی) برسوں کام کر کے انہوں نے سید موصوف کی دعوت و جدوجہد کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے سمجھا ہے۔

سوانحی تذکرے کے ساتھ انہوں نے اپنی کتاب میں مولینا کے تحریکی کام کو مرحلہ وار بیان کیا ہے۔ تاسیس جماعت سے قبل اور اس کے بعد کے ادوار کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ پھر تشکیل پاکستان کے بعد اسلامی دستور کے لیے رائے عام کو منظم و متحرک کر کے مولینا نے اپنی جدوجہد سے جو نتائج و اثرات پیدا کیے ہیں، اُن کو سمیٹا گیا ہے۔

مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ایک بڑا دائرہ اثر چونکہ دنیائے عرب میں پھیلا ہوا ہے، اس لیے یہ کتاب ایک خاص افادیت رکھتی ہے۔ کاغذ، طباعت، ٹائیٹل بہت معیاری ہیں۔

(بقیہ اشارات) مسحور ہوتا ہے۔ اور حضورؐ کے دین سے ٹکرانے والی تحریکوں کے لیے اپنی توانائیاں استعمال کرتا ہے، تو پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی محبتِ رسول کے کیا معنی ہیں۔
ایمان ہے تو اطاعت ایمان کا واضح ثبوت ہے۔

محمد رسول اللہ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ آپؐ کے اس احسان کو مانا جائے جو آپؐ نے دین کو دوسروں تک پہنچانے اور اُسے پھیلانے اور اُسے غالب کرنے کی جان گسل مہم کی صورت میں کیا، اور اس میں ہر قسم کی قربانیاں اور جاں فشانیاں کھپائیں۔ آپؐ کی اسی محنت و قربانی کا نتیجہ ہے کہ ہم تک نعمتِ ایمان پہنچی۔ اس احسان کا کوئی بدلہ دینا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ ہمارے اس جذبۂ ممنونیت کو اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ دکھایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا جائے، یعنی خدا سے دعا کی جائے کہ اے اللہ! تو ہم بے نواؤں کی جانب سے حضورؐ پر انوار اور رحمتیں نازل فرما۔
حضورؐ پر درود بھیجنا فرض ہے، مگر اس بارے میں غلو نہ کیا جائے۔ مناسب ہوگا کہ دُرود سے متعلق چند حقیقتیں یہاں عرض کر دی جائیں۔

۱- درود کوئی نعرہ نہیں ہے، بلکہ ایک عاجزانہ دُعا ہے۔ دُعا اُسی طرح کرنی چاہیے جیسے دُعائیں کی جاتی ہیں۔

۲- جتنا درود پڑھنا لازم ہے، اتنا خدا تعالیٰ نے نمازوں کے اندر رکھ دیا ہے۔ پھر دُعاؤں کے ساتھ اور خطبوں میں دُرود شریف پڑھا جاتا ہے۔ زائد بطورِ نفل کوئی جتنی بار چاہے پڑھے مگر دوسروں سے کسی مستحب کا مطالبہ دھونس سے نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں جس محفل یا گفتگو میں نبیؐ اکرم کا ذکر آئے، اس میں کم سے کم ایک بار درود شریف پڑھ لینا چاہیے۔

۳- درود پڑھنے کے لیے اگر قیام کچھ بھی ضروری ہوتا تو...... خدا اور رسول التحیات میں بحالتِ قعود پڑھنے کا طریقہ مقرر نہ کرتے۔ شریعت کا تقاضا ہوتا تو نماز میں دُرود بحالتِ قیام پڑھنا لازم ہوتا۔

۴- درود یا کوئی دوسرا ذکر بآوازِ بلند مساجد میں نمازوں کے آگے پیچھے پڑھنے سے ایسے نمازیوں کی نماز میں خلل آسکتا ہے جو سنتیں یا نوافل پڑھ رہے ہوں نیز سرّی ذکر کرنے والے اصحاب کے لیے

بھی مشکل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مساجد میں تمام مسلک کے مسلمانوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ جہری ذکر کوئی شخص گھر پر جیسے چاہے کر سکتا ہے۔

۵۔ درود کو جس طرح اذان کا جزو بنایا جا رہا ہے (خصوصاً لاؤڈ اسپیکروں کے اس دور میں) اس کی کوئی نظیر نہ دورِ رسالت میں ملتی ہے، نہ دورِ خلفائے راشدین میں، بلکہ بعد کی صدیوں کی صدیاں بھی اس سے خالی ہیں۔ یکایک چودھویں صدی میں یہ سلسلہ خاص برصغیر میں شروع ہوا۔

عباداتِ خمسہ اور ان کے متعلقات (جیسے کہ وضو اور اذان نماز کے متعلقات ہیں) میں اگر اضافہ ، ردوبدل کو جائز رکھا جائے تو سارا انتظام اُدھڑ سکتا ہے۔ ایک نے کہا کہ اذان سے پہلے درود ضروری ہے، دوسرے نے کہا کہ اقامت سے پہلے ضروری ہے، تیسرے نے کہا کہ رکعت کے اندر سورۂ فاتحہ سے پہلے پڑھنا ضروری ہے، یا رکوع و سجود میں ضروری ہے تو اس کا ردّ کس بنا پر ہوگا؟ اپنی اپنی پسند کی چیزیں داخل کرنے کا سلسلہ چلے تو کوئی کہے گا کہ سورۂ اخلاص پڑھی جائے، کوئی کہے گا کہ آیت الکرسی کا ورد ہونا چاہیے اور کوئی کہے گا کہ آیت کریمہ پڑھی جائے۔

۶۔ درود کو درود کے مقام پر ہی رکھنا چاہیے۔ حضورؐ کے ارشاد کے بموجب افضل الذکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ یہ نہ ہو کہ حضورؐ کے اُمتی درود کو افضل الذکر بنا دیں۔

۷۔ کلمۂ طیبہ ہو یا درود یا کوئی اور اہم دینی شعار اُسے فرقہ وارانہ یا گروہی علامت نہیں بنانا چاہیے۔ جو چیزیں ساری اُمت کے لیے ہیں وہ ساری اُمت کے لیے چھوڑ دینی چاہئیں۔ خاص طور پر یہ رویّہ کہ جو لوگ ایک خاص ڈھنگ سے درود نہ پڑھیں، ان کو اپنے سے گھٹیا مسلمان سمجھا جائے اور اتنی رعونت دکھائی جائے کہ ان کے ساتھ (جہاد کی صف بنانا تو کجا) نماز کی صف نہ بنائی جا سکے۔ بڑی افسوسناک بات ہے۔

مگر ان گذارشات کے بعد میں اپنا نقطۂ نظر یہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ کسی خاص امر میں ایک مسلک بنا چکے ہوں اُن سے چڑنے کی ضرورت بھی نہیں، اُن سے نفرت نہ کی جائے، اُن کے خلاف محاذ نہ بنائے جائیں اور اُن سے نمازیں الگ نہ کی جائیں۔ آہستہ آہستہ افہام و تفہیم ہو سکتی ہے۔ افتراق سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

کلامی اور فقہی اختلافات تو ہیں اور ہوں گے، مگر کسی حال میں ایک سچے محبِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اختلافات کو افتراق کا ذریعہ بنائے یا دوسروں کی طرف سے افتراق کی جو رَو چلائی گئی ہو اُس کے ردِ عمل میں آکر وہ ایک جوابی غلو یا تشدد اختیار کر لے۔

یہ انتباہ اس لیے ضروری ہوا کہ حضورؐ ہم کو ایک متحد اُمت دے کر رخصت ہوئے تھے۔ فرقے دے کر نہیں۔ جس کسی نے حضورؐ کی اُمت میں پہلے تفرقہ ڈالا تھا یا جو آج تفرقہ ڈالتا ہے وہ حضورؐ کی چھوڑی ہوئی امانتِ وحدت میں خیانت کا قصوروار ہے۔ اور وہ اپنے ایمان کو نقصان پہنچاتا ہے۔ حضورؐ ہی کا ارشاد ہے کہ "لا تؤمنوا حتی تحابوا" تم اس وقت تک ایمان سے مالا مال نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو۔" دین کی خدمت کرنے والوں کو محبت کا نقیب ہونا چاہیے اور نفرتوں اور کدورتوں کے خارزار پیدا نہیں کرنے چاہئیں۔

آج ہماری صرف ایک کمی دُنیا بھر میں ہمارے لیے باعث نقصان ہو رہی ہے۔ وہ ہے اتحاد کا فقدان۔ ایک ارب مسلمان دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں مگر کچھ تو نسلی اور علاقائی منافرتوں میں مبتلا ہیں، کچھ دو عالمی قوتوں کی تنزویری کی وجہ سے منقطع ہیں۔ اور کچھ فرقہ وارانہ نزاعات کی وجہ سے دست و گریبان ہیں ـــــ حالانکہ سامنے سے کفر و الحاد کی قوتیں ناوک اندازی کر رہی ہیں۔ آج کتنے ہی علاقے ہیں جہاں مسلمان اغیار کے ظلم کا شکار ہیں۔ مگر وہ اتحاد کی قوت سے محروم ہیں جو تمام مسائل کا حل اور تمام خطرات کا ذریعۂ انسداد ہے۔

رسول اللہ کے لیے ایمان، محبت، اطاعت، پیرویٔ سنّت اور ادب و احسان شناسی کا مسلک اختیار کرنا اور آپ کو اپنا معلم و مزکّی اور حکم اور نمونہ اور قائد و رہبر ماننا حضورؐ کی شفاعت کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

بگڑے ہوئے واعظوں نے عجیب سا تصورِ شفاعت رائج کر دیا ہے، جو اُمّت کے عملی انحطاط کا باعث بن رہا ہے۔ یوں سمجھا جاتا ہے کہ دُنیا بھر کے ایسے مجرموں، چوروں، اُچکوں، جواریوں، رشوت خواروں، خائنوں اور ظالموں کے لیے جو میلاد کراتے ہوں، ختم دلاتے ہوں اور درود پڑھتے ہوں، گویا حضورؐ (نعوذ باللہ) اس انتظار میں کھڑے ہیں کہ وہ پہنچیں تو انہیں سیدھا جنت میں پہنچا دیں۔ کسی عمل و

خدمت کی ضرورت نہیں، نہ کسی گناہ سے پرہیز اور نہ کسی غلط آمدنی سے اجتناب کی پابندی ہے۔

جاننا چاہیے کہ حضورؐ نے اپنے اچھے اچھے اور پیارے صحابیوں کا جنازہ پڑھنے سے اتنی سی بات پر انکار کر دیا کہ اُن کے ذمے کچھ قرض رہ گیا تھا۔ نمازِ جنازہ میں بھی تو خدا سے سفارش اور دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ قرض ادا کر دیا گیا تو حضورؐ نے جنازہ پڑھا۔ پھر کتنی ہی احادیث میں حضورؐ نے بعض کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے "لَيْسَ مِنَّا" یا "لَيْسُوْا مِنِّيْ" فرمایا کہ ایسے اور ایسوں کو مجھ سے یا ہم سے کوئی واسطہ و معاملہ ہی نہیں۔ رشوت لینے والوں سے فرمایا کہ تم اس ناجائز مال کو کندھوں پر لیے ہوئے قیامت کے دن میرے پاس آؤ گے اور کہو گے کہ یا رسول اللہ! ہمیں چھڑائیے، ہماری سفارش کیجیے۔ میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ میں ایسے وبال سے نہیں چھڑا سکوں گا۔ پھر حضورؐ اپنی ہی زبانِ مبارک سے خدا کے ایسے فیصلے سناتے ہیں کہ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا۔ کیا تصور کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے اس فیصلے کو حضورؐ قیامت کے دن بالائے طاق رکھ دیں گے؟ سود کا لین دین کرنے والے سے کہا کہ تمہارے خلاف خدا و رسول کا اعلانِ جنگ ہے۔ پھر کیا قیامت کے دن مصالحت ہو جائے گی؟

شفاعت کا سیدھا سا تصور یہ ہے کہ حضورؐ راست باز مسلمانوں کے لیے خدا کی اجازت سے عرض کریں گے کہ بارالٰہا! یہ فلاں شخص تیرا مخلص بندہ اور میرا اطاعت گزار اُمتی تھا۔ اس نے عبادات بھی ادا کیں۔ انفاق بھی کرتا رہا۔ کلمۂ حق کی سربلندی اور اقامتِ دین کی کوشش بھی کی، حرام سے پرہیز کرتا رہا، بس اس سے ایک یا چند لغزشیں ہو گئی ہیں اور اُن پر بھی اس نے توبہ و شرمساری کی راہ اختیار کی ہے، تو اس کی وسیع خدمات اور مجموعی اطاعت شعاری کی رعایت سے اس کی لغزشوں سے درگزر فرما۔ رہے وہ لوگ جو سوچ سمجھ کر دھڑلے سے جرائم کرتے ہیں، جن کی روزمرہ کی زندگی ہی فسق و فجور میں گھری ہو، جن کے دہن و شکم اور جن کے چشم و گوش حرام کے خوگر ہو چکے ہوں، جن کا پیشہ ہی ظلم ڈھانا اور مخلوقِ خدا کو اذیتیں دینا ہو، اُن کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ بس ختم اور میلاد کے بل پر اُن کا بیڑا پار ہو جائے گا تو یہ دعویٰ ہی خود قرآن کے خلاف ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے تو توبہ کا دروازہ نہیں کھلتا۔ (ليست التوبة للذين......) کجا کہ شفاعت کے دروازے پر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو جنت میں لے جانے کے لیے کھڑے ہوں اور اُن سے فرمائیں کہ شاباش میرے اُمتیو! تم نے خوب

زندگی گزاری، مزے لوٹے، ستم ڈھائے، فساد پھیلائے، مگر مجھ پر درود بھیجتے رہے، آؤ جنت کے قصر و باغ تمہارے لیے آراستہ ہیں۔

خدا کی جنت اور نبی کی شفاعت اتنی سستی چیزیں نہیں ہیں۔ گراں بہا نہ ہوتیں تو حضورؐ کیوں گالیاں سنتے، طائف میں پتھر کھاتے اور اُحد میں دانت شہید کراتے، اور حضورؐ کے اصحاب کیوں کبھی مکہ کی تپتی ریت پر تڑپتے اور کبھی بدر و اُحد میں خاک و خون میں لوٹ جاتے۔ وہ انفاق، وہ ایثار، وہ ہجرت، وہ جہاد، وہ شہادت، وہ سفر، وہ دوڑ دھوپ یاد کرو ___ یہ ہے جنت کو جانے کا راستہ!

مسلمانو! اپنی زندگیاں غلط من سمجھوتوں میں برباد نہ کرو۔

رسولؐ پر ایمان، رسولؐ سے محبت، رسولؐ کی اطاعت، رسولؐ کی طرح دعوت اور گواہی، رسولؐ کی طرح ہجرت کے وقت ہجرت، اور جہاد کے وقت جہاد، رسولؐ کی طرح اقامتِ حق کے لیے سعی و جہد اور رسولؐ کی طرح موقع ملنے پر نظام اسلامی کا عملاً نفاذ، یہ ہیں وہ ذمہ داریاں جن کی یاددہانی سیرتِ رسولؐ یا تذکرہ رسولؐ کا مقصود ہے۔ ان ذمہ داریوں کو سمجھو اور اُن کو اختیار کرو تو انشاء اللہ تمہیں رسولؐ اللہ کی شفاعت اور خدا کی بخشش نصیب ہوگی۔

یہ ربیع الاوّل ہی کا نہیں، سارے مہینوں کا، اور ہر لمحے کا پیغام ہے۔ کیا اسے قبول کرتے ہو؟۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ فِى الدُّنْيَا وَشَفَاعَتَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ ۔ اٰمین۔

رسولِ اکرمؐ کی
حکمتِ انقلاب

صدارتی ایوارڈ یافتہ

از: سید اسعد گیلانی

○

- رب العالمین نے سامانِ زیست کے ساتھ مقصودِ زیست بھی خود بتایا ہے۔
- رحمۃ للعالمین، جو سراپا کمالات، سراپا رحمت اور سراپا ہدایت برائے عالمین ہیں۔
- دعوتِ اسلامی کی اصولی بنیادیں، مزاجی خصوصیات اور عمومی خدوخال کیا ہیں؟
- حضورؐ کا انقلاب آفریں اسلحہ، معجزہ کردار، معجزہ قرآن اور معجزہ کلام۔
- حضورؐ کی حکمتِ انقلاب، فرد کی تیاری، تنظیم کی تربیت، ہجرت کی مورچہ بندی اور جہاد میں مضمر ہے۔
- متوازن اسلامی انقلابی معاشرہ سات اجتماعی ستونوں پر قائم ہے۔
- اسلامی انقلاب سات حکمتوں پر مبنی ہے۔
- رسولِ اکرمؐ کی حکمتِ انقلاب کی ۳۵ تدابیر کا مورخانہ تذکرہ ناقابلِ فراموش علمی بحث ہے۔
- تاریخِ انسانی کا جامع ترین انقلاب جو واحد حقیقی انقلاب ہے۔

○

یہ کتاب ان حکمتوں کو زیرِ بحث لاتی ہے، جن پر عمل کر کے دنیا کے ہر معاشرے میں اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

ضخامت: ۶۸۰ ○ نقشے ۴ ○ تصاویر متعدد

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ - رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور